دیوتا کی موت

طارق اسمٰعیل ساگر

فہرست

1.	خیر خواہ	2
2.	شکار	13
3.	خودکشی	36
4.	مکڑوال	46
5.	ایک نئی خبر	65
6.	مشتبہ نائب	76
7.	تعاقب اور ٹکراؤ	87
8.	برے پھنسے	97
9.	دھمکی اور دھماکہ	105
10.	دیوتا سے ملاقات	113
11.	ویل ڈن	125
12.	نئے دیوتا کی آمد	135
13.	دو دو ہاتھ	145
14.	سازش	150
15.	وارنٹ گرفتاری	156
16.	پراسرار بوڑھا	164
17.	غیبی امداد	171
18.	قربانی کے بکرے	189
19.	اندھیرے کا تیر	206

خیر خواہ

دوپہر کا ایک بج چکا تھا' سکول میں چھٹی ہو چکی تھی اور بچے سکول سے باہر آ رہے تھے۔ اس سکول میں غریب لوگ اپنے بچوں کو پڑھانے کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ یہاں دولتمند اور بڑے لوگوں کے بچے ہی کو داخلہ ملتا تھا۔ سکول کے باہر سڑک کے دونوں کناروں پر گاڑی رکنے کی دیر تھی کہ بوڑھا لپک کر اس کے نزدیک پہنچ گیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو جھلملا رہے تھے اور خاصا پریشان دکھائی دے رہا تھا۔ اس کی شکل پر ایک نظر ڈالتے ہی بابے حمیدے کا دل بھر آیا۔

''کیا بات ہے بھائی''؟ اس نے شیشے سے گردن باہر نکال کر پوچھا۔

''میری بیوی کی حالت بہت خراب ہے۔ ہم نزدیکی کوٹھی میں کام کرتے ہیں۔ گھر پر کوئی بھی نہیں ہے۔ صاحب اور میم صاحب کسی کام سے گئے ہیں۔ اس کی حالت اچانک خراب ہو گئی ہے اور کوئی سواری بھی نہیں مل رہی۔ خدا کے لئے تم ہمیں نزدیکی مشن ہسپتال پہنچا دو۔ خدا تمہارا بھلا کرے گا''.....

اتنا کہہ کر بوڑھے کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔

مشن ہسپتال یوں بھی حمیدے کے راستے میں پڑتا تھا۔ اس نے سوچا نجانے بیچارے کس

مصیبت میں مبتلا ہیں جو اس سے لفٹ کیلئے درخواست کی ہے۔اس نے باہر نکل کر کار کا دروازہ کھول دیا اور بوڑھے سے کہا کہ اپنی بیوی کو یہاں لے آئے ''بھائی خدا تمہارا بھلا کرے۔ ذرا میری مدد کردو' ہم دونوں اسے سہارا دے کر لے آتے ہیں۔اس میں تو ایک قدم چلنے کی ہمت ہی باقی نہیں ہے''۔بوڑھے نے بڑے ملتجی لہجے میں کہا۔

''اچھا آؤ۔''

اتنا کہہ کر بابا حمید اور خت کی طرف بڑھا۔درخت کے نزدیک پہنچ کر دونوں نے چاہا کہ جھک کر عورت کے بازو تھام لیں اور اسے سہارا دے کر کھڑی کرلیں۔عورت بیچاری درخت کے تنے سے ٹیک لگائے درد سے کراہ رہی تھی۔جیسے ہی بابے حمیدے نے جھک کر اسے سہارا دینا چاہا' اس کے چودہ طبق روشن ہوگئے۔درخت کی اوٹ میں چھپے ان کے ساتھی نے اچانک ہی اس کے سر پر ڈنڈے سے زوردار ضرب لگائی'

حملہ اتنا شدید شدید تھا کہ بابے حمیدے کو ایک لمحے کیلئے سنبھلنے کی مہلت بھی نہ مل سکی۔اس کو سر کے پچھلے حصے پر ضرب لگنے کا احساس ضرور ہوا لیکن وہ حملہ آور کی شکل بھی نہ دیکھ سکا اور اس کا ذہن تاریکی میں ڈوبنے لگا۔بابا حمید الڑکھڑا کر وہیں ڈھیر ہوگیا۔

یہ زیادہ معروف شاہراہ نہیں تھی۔اِکا دُکا گاڑیاں ہی ادھر سے گزرا کرتی تھیں۔پھر اس بلا کی گرمی میں بغیر ضرورت کے گھر سے باہر نکلتا بھی کون ہے؟ بابا حمید اب ہوش ہو چکا تھا۔اسے ہوش آیا تو وہ ایک کمرے میں بند تھا۔جس میں صرف وہی ایک چارپائی تھی جس پر اسے لٹایا گیا تھا۔بابے حمیدے نے ہوش میں آکر جب گردن کو گھمانا چاہا تو اس کے سر کے پچھلے حصے میں درد کی زوردار لہر اٹھی۔بابے حمیدے کے منہ سے کراہ نکل گئی۔جلد ہی ہوش نے اپنی حالت کو سنبھال لیا۔

اوسان بحال ہوئے تو اسے پچھلے تمام واقعات یاد آگئے اور اس بات کی بھی سمجھ آگئی کہ ان لوگوں نے یہ سارا ڈھونگ اس سے گاڑی چھیننے کے لئے رچایا تھا۔لیکن کیا وہ صرف گاڑی ہی چھیننا چاہتے تھے؟

اس سوال نے بابے حمیدے کو پریشان کر کے رکھ دیا۔اسے اپنی تو نہیں رہ رہ کر تنویر کی فکر

ستا رہی تھی اور وہ دل ہی دل میں دعائیں مانگ رہا تھا کہ خدا کرے اس کا چھوٹا صاحب بخریت گھر پہنچ گیا ہو۔یہ بات تو اس کو بھی بخوبی سمجھ آسکتی تھی کہ اگر ان لوگوں نے صرف کار ہی چھیننی تھی تو اس یہاں کیوں لے آئے ہیں؟ ظاہر ہے انکے مقاصد کچھ اور تھے۔بابا حمیدے نے اندازہ لگایا کہ وہ کسی گھر کے تہہ خانے میں بند ہے کیونکہ یہاں گرمی کا احساس نہیں ہو رہا تھا۔گو کہ اس کے سر میں شدید درد تھا۔لیکن بے چارہ بابا حمید اپنا درد بھول کر اپنے ''چھوٹے صاحب'' کی فکر کرنے لگا۔

☆☆☆☆☆

تنویر جب چھٹی کے بعد اپنے ساتھیوں کے ساتھ سکول کے دروازے سے باہر نکلا تو آج پہلی مرتبہ اسے قدرے الجھن ہوئی کیونکہ گاڑی دور دور تک دکھائی نہیں دے رہی تھی۔جب کہ اسکے ساتھی اسے خدا حافظ کہہ کر اپنی اپنی کار کی طرف بڑھ رہے تھے۔اس نے سوچا بابا حمید اتو کبھی لیٹ نہیں ہوا۔خدا خیر ہی کرے۔

تنویر کو سوچ میں مبتلا دیکھ کر اس کے ایک دوست نے کہا

''آؤ یار میں تمہیں راستے میں ڈراپ کرتا جاؤں گا.....''

ابھی تنویر یہ سوچ ہی رہا تھا کہ اسے کیا جواب دے کہ اسے کاروں کے ہجوم کے درمیان سڑک پر اپنی کار دروازے کی طرف آتی دکھائی دی۔

''شکریہ دوست! میری گاڑی آگئی.....''

اس نے گاڑی پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ڈرائیور نے گاڑی ایک خالی جگہ دیکھ کر پارک کردی تھی۔تنویر خود ہی اس طرف بڑھا کیونکہ گاڑی یہاں تک نہیں آسکتی تھی۔گاڑی کے نزدیک پہنچ کر وہ ٹھٹھکا کیونکہ گاڑی میں بابے حمیدے کے بجائے کوئی اور ڈرائیور موجود تھا۔

''سلام چھوٹے صاحب''.....اسے اپنے نزدیک آتا دیکھ کر ڈرائیور نے دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔

''کون ہو تم؟.....میں نے تمہیں پہلے کبھی نہیں دیکھا اور بابا حمید اکہاں ہے؟''

تنویر نے اس کے سلام کا جواب دیتے ہوئے پوچھا۔

"صاحب میں فیکٹری کا ڈرائیور ہوں۔ آج سیٹھ صاحب حمیدے کے ساتھ کسی کام سے گئے ہیں۔ انہیں دیر ہوگئی تھی۔ انہوں نے فون پر مجھے حکم دیا تھا کہ آپ کو سکول سے لے آؤں"۔

ڈرائیور نے جو شکل سے بڑا شریف نظر آرہا تھا کہا۔

"لیکن ڈیڈی نے مجھے تو بتایا نہیں"

تنویر نے کہا

جناب! انہیں اچانک کام پڑا تھا۔ بیگم صاحبہ بھی ان کے ساتھ ہی گئی ہیں۔ مجھے معاف کر دیں میں چند منٹ لیٹ ہوگیا۔ آپ کی مہربانی آپ صاحب سے شکایت نہ کرنا"۔ اس نے منت کے سے انداز میں کہا۔

"اچھا! ٹھیک ہے۔ چلو!" اتنا کہہ کر تنویر گاڑی میں بیٹھ گیا۔

گاڑی چل دی۔ جب وہ اپنی کالونی کی طرف جانے والی سڑک پر پہنچے تو ڈرائیور نے اچانک ہی کار دوسری طرف موڑ لی۔

"کیا بات ہے؟ کدھر جا رہے ہو؟"..... تنویر گھبرا گیا۔

"صاحب آپ کی بڑی مہربانی سامنے والی کوٹھی میں میرا بھائی ملازم ہے۔ اسے ایک پیغام دینا ہے۔ میری ماں گاؤں میں بیمار ہے۔ اسے کہنا ہے فوراً گھر چلا جائے۔ آپ کی بڑی مہربانی ہوگی"۔

تنویر چپ ہوگیا۔ ڈرائیور نے بات ہی ایسی کہہ دی تھی۔ وہ اسے انکار نہیں کر سکتا تھا۔

ڈرائیور نے اس کی خاموشی کو رضامندی جانا اور ایک نزدیکی کوٹھی کے گیٹ کے نزدیک رک کر ہارن دیا۔ ہارن کی آواز پر گیٹ یوں کھلا جیسے اندر موجود شخص پہلے ہی سے ان کا منتظر رہا ہو۔ جیسے ہی کار دروازے سے اندر داخل ہوئی۔ گیٹ بند کر دیا گیا۔ تنویر نے گردن گھما کر دروازہ بند دیکھا تو وہ گھبرا گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ ڈرائیور سے کوئی استفسار کرتا۔ اس نے دیکھا سامنے برآمدے سے چار بدمعاشوں نے باہر نکل کر کار کو گھیرے میں لے لیا ہے۔

اس کے ساتھ ہی کار کا دروازہ کھلا اور ان میں سے ایک نے تنویر کو بازو سے پکڑ کر باہر کھینچ لیا۔ تنویر نے ذرا سی مدافعت کی، پھر رونا شروع کر دیا۔ ابھی اس کی رونے کی آواز ہی نکلی تھی جب ایک دوسرے بدمعاش نے اس کے منہ پر رومال رکھ دیا۔ یہ رومال بے ہوش کرنے والی دوا کلوروفارم میں بھیگا ہوا تھا۔ جیسے ہی تنویر نے دو تین سانس لئے اس کے حواس خطا ہونے لگے۔ پھر وہ اس آدمی کے بازوؤں میں جھول گیا۔

تنویر بے ہوش ہو چکا تھا۔

☆☆☆☆☆

بابا حمید اسوچ ہی رہا تھا کہ کیا کرے؟ کسی کو آواز دے یا نہ دے۔ جب اچانک اس نے اپنی پشت پر دروازہ کھلنے کی آواز سنی۔ اسی دروازے سے دھوپ بھی اندر آنے لگی تھی۔ اس نے دیکھا دروازے سے ایک ہٹا کٹا شخص کسی بے ہوش بچے کو کندھے پر ڈالے اندر داخل ہو رہا ہے۔

بابا حمید اتو لرز کر رہ گیا۔

آنے والے کو جیسے اس بات کا احساس ہی نہیں تھا کہ کوئی اور بھی اندر موجود ہے۔

بابا حمید اگھبرا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ آنے والے نے اسی چارپائی پر بچے کو لٹا دیا۔ بچہ بے ہوش تھا۔ اس کی شکل پر نظر پڑتے ہی بے اختیار بابا حمیدے کے منہ سے نکلا "چھوٹے صاحب"

آنے والے نے زوردار قہقہہ لگایا اور بولا..... "سنبھالو اپنے چھوٹے صاحب کو.....!"

"بکواس مت کرو"..... بابا حمید اغصے سے چلایا۔

اسے اب بخوبی اندازہ ہوگیا تھا کہ وہ دونوں کسی خطرناک گروہ کے ہاتھ لگے ہیں اور ان لوگوں نے دراصل یہ سارا کھیل تنویر کو اغوا کرنے کے لئے رچایا تھا۔

"ظالمو! مجھے مار ڈالو! لیکن خدا کے لئے اسے کچھ نہ کہو۔ اس معصوم نے تمہارا کیا بگاڑا ہے؟ کیوں اس کو اٹھا لائے ہو"۔

بابا حمیدے کی اس بات کا جواب دینے کی بجائے اسی شخص نے پھر زوردار قہقہہ لگایا۔

"مجھے میری بات کا جواب دو" بابا حمید ااتنے زور سے چلایا کہ اس کو کھانسی کا دورہ پڑ گیا۔

ابھی وہ کھانس ہی رہا تھا جب اس نے سیڑھیوں سے ایک اور لحیم شحیم بدمعاش کو نیچے اترتے دیکھا۔ جس نے ہاتھ میں پستول پکڑا ہوا تھا۔

''میں دیتا ہوں تمہارے سوال کا جواب''۔ اس نے پستول والا ہاتھ لہراتے ہوئے کہا۔

''اسے باہر لے آؤ''۔ اس نے اپنے ساتھی کو حکم دیا۔

''چل اوئے بڈھے''۔ اس کے ساتھی نے قہقہہ لگا کر بابے حمیدے کے بازو کو پکڑ کر اور جھٹکا دیا۔

''میں اپنے چھوٹے صاحب کو چھوڑ کر نہیں جا سکتا''۔ بابے حمیدے نے مدافعت کی۔

''خبردار!''..... سیڑھیوں میں کھڑے بدمعاش کی آواز میں جانے کیا چھپا تھا کہ بابا حمیدا سہم کر رہ گیا۔

''اگر اس کی زندگی چاہتے ہو تو چپ چاپ ہمارے احکامات پر عمل کرو۔'' اس نے پستول کی نالی سے بے ہوش تنویر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

بابا حمیدا چپ چاپ سیڑھیوں کی طرف چل دیا۔ سیڑھیوں کا خاتمہ ایک اور کمرے میں ہوا تھا۔ جہاں پہلے ہی سے تین آدمی موجود تھے۔ تینوں شکل ہی چھٹے ہوئے بدمعاش لگتے تھے۔

تمہیں اندازہ ہو گیا ہو گا کہ ہم لوگ کون ہیں۔ ہم کوئی شریف آدمی نہیں۔ نہ ہی تمہیں اور تمہارے چھوٹے صاحب کو سیر کروانے لائے ہیں۔ اگر تم سیٹھ کے بیٹے کی زندگی چاہتے ہو تو جیسے ہم کہیں چپ چاپ ویسے ہی کرتے جانا' ورنہ یاد رکھنا تمہاری تو جان جائے گی ہی' یہ بیچارہ بھی مفت میں مارا جائے گا۔''

''مجھے کیا کرنا ہے؟'' بابے نے بے چینی سے پوچھا۔

''ابھی سمجھ آ جائے گی۔'' اس نے جواب دیا۔

پھر ساتھیوں کی طرف متوجہ ہوا۔ ''جاؤ اسے رہا کر دو''۔

تینوں اس کا حکم سن کر بابے کی طرف بڑھے۔ ایک نے بابے حمیدے کے دونوں ہاتھ وہاں پہلے ہی سے موجود چھوٹی سی رسی کے ذریعے پیچھے کی طرف باندھ دیئے۔ دوسرے نے اس کی

آنکھوں پر سیاہ رنگ کی پٹی باندھ دی۔ بابے حمیدے نے بغیر کسی چون و چراں کے ان کے احکامات کی تعمیل کی اور بالکل مدافعت نہیں کی۔ اسے یقین ہو چلا تھا کہ یہ لوگ صرف دھمکیاں دینے والے ہی نہیں' بلکہ جو کچھ کہتے ہیں وہ کر گزرنے کی اہلیت بھی رکھتے ہیں۔

''میری بات دھیان سے سنو!'' حمیدے کو اس شخص کی مکروہ آواز سنائی دی۔ ''ہم تمہیں ایک خط دے رہے ہیں۔ اسے اپنے سیٹھ تک پہنچا دینا۔ اگر یہ خط تم نے کھول کر پڑھا یا سیٹھ رمضان کے بجائے کسی اور کے ہاتھ میں دیا تو یاد رکھنا' اس کا انجام بڑا بھیانک ہو گا۔'' اسی کے ساتھ ہی اس نے بابے حمیدے کی جیب میں پہلے سے تیار شدہ لفافہ ڈال دیا۔

''لے جاؤ اسے''۔ اس نے زوردار قہقہہ لگا کر اپنے ساتھیوں کو حکم دیا۔

☆☆☆☆☆

بابے حمیدے کا بازو پکڑ کر ایک شخص اسے باہر لے آیا اور اسے پہلے سے موجود ایک وین میں بٹھا دیا۔ بابے حمید کے بیٹھتے ہی وین سٹارٹ ہو کر چل دی۔ اسے احساس ہو رہا تھا اس میں پہلے بھی کچھ لوگ موجود ہیں۔ لیکن کسی نے دوسرے کے ساتھ بات تک نہ کی تھی۔

وہ لوگ بابے حمیدے کو قریباً آدھ گھنٹہ تک مختلف سڑکوں پر گھماتے رہے۔ بابے حمیدے کو کچھ اندازہ نہ تھا کہ وہ کہاں ہے اور یہ لوگ کہاں جا رہے ہیں۔ اس کے بعد وین رک گئی اور کسی نے اس کے ہاتھ بھی کھول دیئے۔ پھر اس کی آنکھوں سے پٹی بھی کھول دی۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے بابے کو دھکا دے کر وین سے نیچے پھینک دیا۔

آنکھوں پر مسلسل پٹی بندھے رہنے سے بابے حمیدے کی آنکھیں دکھنے لگی تھیں۔ جلد ہی وہ نارمل ہو گیا۔ شام ڈھل رہی تھی۔ سب سے پہلے اس نے اپنی جیب کو ٹٹول کر دیکھا۔ لفافہ موجود تھا۔ اس نے اندازہ لگایا کہ وہ کالونی کے نزدیک ہی ایک ویران سڑک پر کھڑا ہے۔

''اف میرے خدایا! سیٹھ صاحب کے دل پر کیا گزر رہی ہو گی!'' بابے نے سوچا۔

وہ پیدل ہی گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ قریباً پندرہ بیس منٹ بعد وہ گھر پہنچ گیا۔ گیٹ پر موجود چوکیدار اسکی شکل پر نظر پڑتے ہی بھاگ کر اندر چلا گیا۔ غالباً وہ سیٹھ صاحب کو اسکی آمد کی

اطلاع دینے گیا تھا۔

پریشان حال سیٹھ بابے حمیدے کی آمد کی خبر سن کر تیزی سے اپنے کمرے سے باہر نکل آئے۔لیکن بابے حمیدے کو اکیلا دیکھ کر وہ گھبرا گئے۔

''الٰہی خیر!'' ان کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

''سیٹھ صاحب!'' اپنے مالک کی شکل پر نظر پڑتے ہی بابے حمیدے کی آنکھیں چھلک پڑیں' لیکن اس نے خود کو سنبھالا۔

تھوڑی دیر بعد وہ سیٹھ صاحب کو ان کے کمرے میں بیٹھا ان کو پیش آنے والے واقعات سے آگاہ کر رہا تھا۔اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔خود سیٹھ صاحب کا برا حال تھا۔ان کی بیگم کو تو غشی کے دورے پڑ رہے تھے۔جیسے ہی اپنی کہانی ختم کر کے بابے نے سیٹھ صاحب کو وہ لفافہ نکال کر دیا جو تنویر کو اغواء کرنے والوں نے ان کیلئے بھیجا تھا' انہوں نے بے چینی سے لفافہ چاک کر کے اسمیں سے خط نکال لیا۔اس پر لکھا تھا:

''سیٹھ صاحب!

آپ بہت مال دار اسامی ہیں' بلکہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اس ملک کے امیر ترین لوگوں میں آپ کا شمار ہوتا ہے۔تنویر آپ کا اکلوتا بیٹا ہے' اور ظاہر ہے آپ کو اس سے بہت محبت ہوگی۔یوں تو آپ اپنے بیٹے کے لئے جان بھی دے سکتے ہیں کیونکہ اولاد سے زیادہ پیاری شے اس دنیا میں اور کیا ہے۔مگر ہمیں آپ کی جان کی نہیں آپ کے مال کی ضرورت ہے۔اگر آپ کو اپنے بیٹے کی زندگی عزیز ہے تو فوراً پچاس لاکھ کا بندوبست کر لیجئے۔یہ آپ کے لئے بہت معمولی رقم ہے۔لیکن 50 لاکھ روپے ہمیں ملنے پر آپ کو آپ کا بیٹا مل جائے گا۔

دوسری صورت میں آپ کے بیٹے کو ہم مار ڈالیں گے اور آپ اس کے غم میں مر جائیں گے۔ہمیں امید ہے آپ کو یہ منظور نہیں ہوگا۔

اور ہاں سیٹھ صاحب!

ایک بات کا خاص خیال رہے کہ اس واقعے کی ہوا کسی کو نہیں لگنی چاہئے۔اگر یہ خبر آپ کے

گھر سے باہر نکلی تو یاد رکھیئے ہم تنویر کو مار ڈالیں گے۔زیادہ چالاکی دکھانے کی کوشش بھی نہ کیجئے گا۔ خاص طور سے پولیس سے ہوشیار رہیں۔ہم جلد ہی آپ سے رابطہ قائم کریں گے۔آپ کل شام تک 50 لاکھ روپے کے کرنسی نوٹ سو سو کے نوٹوں کی شکل میں ایک بریف کیس میں جمع کر لیجئے۔ رقم دینے کا طریقہ بھی آپ کو بتا دیا جائیگا۔

یاد رکھیئے! ہم سے تعاون میں آپ کی خیریت ہے اور پولیس سے تعاون میں آپ کے بیٹے کی جان بھی جا سکتی ہے۔

فقط.....آپ کے خیر خواہ!''

سیٹھ صاحب جوں جوں خط پڑھتے جا رہے تھے ان کے چہرے کا رنگ پیلا پڑتا جا رہا تھا۔ ان کے ماتھے پر پسینے کی بوندیں نمودار ہونے لگی تھیں۔وہ تو پہلے ہی دل کے مریض تھے۔خط کے ختم ہوتے پر وہ اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر صوفے پر ڈھیر ہو گئے۔بابے حمیدے کی تو جان ہی نکل گئی۔اس کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ کیا کرے! کدھر جائے! وہ گھبرا کر کمرے سے باہر نکل آیا تا کہ کسی کو مدد کیلئے پکارے۔

☆☆☆☆☆

جس وقت بابا حمید اگھبراہٹ کے عالم میں کمرے سے باہر نکل رہا تھا' عین انہی لمحات میں سیٹھ رمضان کے دوست آئی جی پولیس مسٹر آفریدی کمرے میں داخل ہوئے۔وہ آج اپنے دوست سے کافی دنوں کے بعد ملنے آئے تھے۔دفتر میں انہیں اپنی بیگم کا فون ملا تھا کہ سیٹھ صاحب کی طرف جائیں۔گاڑی انہوں نے برآمدے کے سامنے پارک کر دی۔چوکیدار انہیں اچھی طرح پہنچانتا تھا۔ان کا آنا جانا اس گھر میں اکثر لگا رہتا تھا۔

تھوڑی دیر پہلے ہی ان کی بیگم نے انہیں مطلع کیا تھا کہ مسز سیٹھ رمضان نے اطلاع دی ہے کہ تنویر ابھی تک گھر واپس نہیں آیا۔

بابے حمیدے نے جب انہیں دیکھا تو اس کے ہاتھ پاؤں اور زیادہ پھول گئے۔اس نے گھبراہٹ میں کچھ کہنا چاہا لیکن زبان نے گویا ساتھ دینے سے انکار کر دیا۔آفریدی صاحب

سیدھے اسی کمرے میں چلے آئے سیٹھ رمضان کی حالت پر نظر ڈالتے ہی انہوں نے بابے حمیدے سے کچھ کہے بغیر فون اٹھایا اور ڈاکٹر کو فوراً وہاں پہنچنے کی ہدایت کر کے سیٹھ رمضان کے نزدیک آ گئے۔

اب وہ بابے حمید کے کے ساتھ مل کر سیٹھ صاحب کو ہوش میں لانے کی کوشش کرنے لگے۔ اسی اثنا میں ان کی نظر سیٹھ صاحب کے نزدیک پڑے خط پر پڑ چکی تھی۔ اس سے پہلے کہ بابا حمیدا اس خط کو غائب کرتا انہوں نے خط اٹھایا اور پڑھنا شروع کر دیا۔ اب انہیں تمام معاملے کی سمجھ آ گئی تھی۔ بابے حمیدے کا تو رنگ ہی فق ہو گیا۔

خط پڑھ کر انہوں نے بابے حمیدے کی طرف دیکھے بغیر خط کو تہ کر کے جیب میں رکھ لیا۔ ڈاکٹر آ گیا تھا اس کی کوششوں سے جلد ہی سیٹھ رمضان کو ہوش آ گیا ڈاکٹر نے انہیں ایک انجکشن لگایا اور کچھ دوائیاں دے کر چلا گیا۔ ڈاکٹر کے رخصت ہوتے ہی سیٹھ صاحب کو خط کی فکر دامن گیر ہوئی۔ انہوں نے بے قراری سے ادھر ادھر نظریں دوڑائیں۔

"گھبراؤ نہیں۔ خط میرے پاس ہے"۔ اتنا کہہ کر آئی جی صاحب نے خط اپنی جیب سے نکال کر سیٹھ رمضان کو دے دیا۔

"اف میرے خدایا! اگر ان لوگوں کو علم ہوا کہ میں نے اس خط کی ہوا بھی تمہیں لگنے دی ہے تو وہ میرے بیٹے کو....."۔ اس سے آگے سیٹھ صاحب کچھ نہ کہہ سکے۔

"حوصلہ کرو سیٹھ رمضان! مجھے احساس ہے کہ تم کیسی مشکل میں گرفتار ہو چکے ہو۔ لیکن اس بات کو مت بھولو کہ میں صرف پولیس آفیسر ہی نہیں، تمہارا بچپن کا دوست بھی ہوں اور تنویر میرا بھی بیٹا ہے"

"لیکن آفریدی! یہ سب خطرناک لوگ معلوم ہوتے ہیں۔"

"مجھے بھی علم ہے۔ اس خط سے اندازہ ہوتا ہے۔ ہمت ہار دینے سے تو بات نہیں بنے گی۔" انہوں نے کہا۔

"آفریدی! میں کوئی خطرہ مول لینا نہیں چاہتا۔ میں ان لوگوں کو رقم دینے کے لئے تیار

ہوں۔ خدا کے لئے تم اس معاملے میں نہ آنا۔" انہوں نے گھبراہٹ کا اظہار کیا۔

"رمضان! ذرا ٹھنڈے دل سے سوچو! کیا مجرموں کی بات مان لینا ہی مسئلے کا حل ہے۔ پھر اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ رقم لینے کے بعد بھی وہ لوگ تنویر کو رہا کریں گے یا نہیں"۔ آفریدی صاحب نے کہا۔

ایک لمحے کے لئے پھر سیٹھ رمضان کو زمین اپنے پاؤں تلے سے سرکتی محسوس ہوئی۔ "حوصلہ رکھو! تم یہی سمجھو کہ میں نے یہ خط دیکھا ہی نہیں اور تم دونوں کے سوا کسی کو اس واقعے کا علم ہی نہیں ہے۔ اگر کوئی تنویر کے متعلق دریافت بھی کرے تو اسے یہی کہو کہ تم نے اسے کسی عزیز کے ہاں بھیج دیا ہے۔ صبح سب سے پہلے کام یہی کرنا کہ اس کے سکول رخصت کی درخواست بھیج دو۔"

آفریدی صاحب نے انہیں ہدایات دینا شروع کیں۔ پھر وہ بابے حمیدے سے کرید کرید کر واقعات دریافت کرتے رہے۔ مجرموں کے حلیے جو بابے حمیدے نے بیان کئے تھے انہوں نے وہیں کاغذ قلم منگوا کر نوٹ کئے۔ پھر وہ سیٹھ صاحب کو علیحدگی میں کچھ باتیں سمجھاتے رہے۔ انہوں نے بابے حمیدے کو بھی نصیحت کی تھی کہ وہ کسی کو بھی ان واقعات کی ہوا نہ لگنے دے۔ انہوں نے سیٹھ صاحب سے کہا کہ وہ اپنی بیگم کو اعتماد میں لے کر یہ سب کچھ بتا دیں لیکن انہیں بھی سمجھا دیں کہ وہ کسی سے بات نہ کریں۔ پھر کچھ سوچ کر انہوں نے خود ہی مسز رمضان سے بھی بات کر لی۔ وہ بڑی حوصلے والی خاتون تھیں۔ انہوں نے تحمل سے آفریدی صاحب کی باتیں سنیں اور انہیں مکمل تعاون کا یقین دلایا۔

آفریدی صاحب نے ان حالات میں زیادہ دیر تک رکنا مناسب نہ جانا اور رخصت ہونے سے پہلے انہیں پھر یہی کہا کہ وہ اس بات کو بھول جائیں کہ آفریدی صاحب کو واقعات کا علم ہو چکا ہے۔ اپنے دوست کو حوصلہ دے کر وہ باہر نکل آئے۔ ان کی گاڑی کیپٹن علی کے گھر کی طرف جا رہی تھی۔

شکار

ابھی آئی جی صاحب کو وہاں سے روانہ ہوئے چند منٹ ہی گزرے تھے کہ فون کی گھنٹی بجنے لگی۔

''ہیلو!'' انہوں نے نحیف سی آواز میں کہا۔

''تم پہچان تو جاؤ گے کہ میں کون بول رہا ہوں؟'' دوسری طرف سانپ کی پھنکار گونجی۔ سیٹھ رمضان کو فوراً احساس ہو گیا تھا کہ اس کا مخاطب کون ہے لیکن وہ انجان بنے رہے۔ ''میں سمجھا نہیں کون ہو تم۔''

''سیٹھ! اب اتنے بھولے بھی نہ بنو۔ تمہارا بیٹا ہمارے قبضے میں ہے۔ بولو کیا ارادے ہیں؟'' دوسری طرف سے وہی آواز گونجی۔

''اچھا' تو تم ہو۔ دیکھو میں تمہیں کہتا ہوں میرے بیٹے کو چھوڑ دو ورنہ تم بچ نہیں سکو گے۔'' انہوں نے آئی جی کی ہدایت کے مطابق گفتگو شروع کی۔

''تو اس کا مطلب یہ ہے سیٹھ کہ تمہارا دماغ ابھی درست نہیں ہوا۔ خیر جلدی سمجھ جاؤ گے۔ کل تک کی مہلت دے رہے ہیں۔ ایک مرتبہ پھر سوچ لو۔ تمہارا دماغ درست ہو جائے تو دوبارہ

رابطہ قائم کریں گے۔

اس کے ساتھ ہی فون پر سیٹھ صاحب کو اپنے بیٹے کی آواز سنائی دی۔ ''ڈیڈی! یہ سب خطرناک لوگ ہیں۔ ان کی بات خدا کے لئے مان لیجئے ورنہ یہ مجھے مار ڈالیں گے۔''

''تنویر! بیٹے..... ہیلو..... ہیلو.....'' سیٹھ صاحب نے کچھ کہنا چاہا لیکن دوسری طرف سے سلسلہ منقطع ہو گیا۔

آئی جی مسٹر آفریدی اس وقت کیپٹن علی اور اس کے ساتھیوں کے ساتھ بیٹھے تھے۔ انہوں نے تنویر کے اغوا کے واقعات اور بابے حمیدے کی زبانی علم میں آنے والی تمام تفصیلات سے انہیں آگاہ کرنے کے بعد کہا:

''کیپٹن علی! تمہیں تو علم ہو گا کہ آج ہی اس شہر میں اسی نوعیت کی چار وارداتیں ہوئی ہیں۔''

''جی ہاں! اور ان تمام وارداتوں کے لئے قریباً ایک ہی طریق کار اپنایا گیا ہے۔ بلکہ اغوا ہونے والے ایک اور بچے کا تعلق بھی اسی سکول سے ہے جس سے تنویر کا تعلق ہے اور وہ بھی ایک کروڑ پتی کا بچہ ہے۔'' کیپٹن علی نے بتایا۔

کیپٹن علی اپنے ملک کا مانا ہوا انٹیلی جنس آفیسر تھا۔ اسکی ذہانت اور بہادری کا یہ عالم تھا کہ دنیا کے بڑے بڑے مجرم اس کا نام سنتے ہی کانوں کو ہاتھ لگایا کرتے تھے۔ کیونکہ اس سے ٹکرانے کا مطلب تھا اپنی موت کو دعوت دینا۔ اس کے متعلق عجیب عجیب افواہیں پھیلی ہوئی تھیں۔ کوئی اسے پولیس آفیسر کہتا تو کچھ لوگوں کے نزدیک وہ مانا ہوا شکاری تھا۔ ایسے لوگ بھی موجود تھے جو اسے کرائے کا قاتل سمجھتے۔ اس کی کامیابی کا راز یہی تھا کہ اس نے اپنے متعلق کسی کو جاننے کا موقع نہیں دیا تھا۔ بہت کم لوگوں کو علم تھا کہ وہ اپنے ملک کی انتہائی اہم شخصیت ہے اور شعبہ سراغراساں کا ایک قابل اعتماد افسر ہے اور اسے اپنے ملک کی حکومت میں ایک اہم مقام حاصل ہے۔ مشکل ترین کام اسے سونپے جاتے تھے اور ان معاملات سے نمٹنے کے لئے اسے خصوصی اختیارات بھی حاصل تھے۔

کیپٹن علی اپنے کسی بھی عمل کے لئے صرف ملک کے سربراہ یا پھر چند اہم شخصیتوں کے

سامنے ہی جوابدہ تھا۔اس نے اپنے ملک کے علاوہ دوست ممالک کے لئے بھی اہم کارنامے سرانجام دیے تھے۔کئی دوست ممالک بھی ضرورت کے وقت اس کی خدمات حاصل کرتے تھے۔

کیپٹن علی کے اسسٹنٹ کا نام تو کچھ اور ہی تھا لیکن لوگ اسے عامر کے نام سے جانتے تھے۔جس طرح علی کے اصلی نام کا بھی کسی کو علم نہ تھا اسی طرح عامر کی اصلیت سے بھی کم لوگ ہی واقف تھے۔عامر بھی علی کی طرح بہادر اور حاضر دماغ تھا۔موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکرانا اس کی عادت تھی۔دشمنوں کے چنگل میں پھنس کر ہمت ہارنا تو اس نے سیکھا ہی نہیں تھا۔وہ نہ صرف دلیری سے دشمن کا مقابلہ کرتا بلکہ انتہائی خطرناک حالات میں اپنے ساتھیوں کو بھی ہنساتا رہتا تھا۔مشکلات کے دوران اس کی لطیفہ بازی جاری رہتی۔اسی طرح وہ خود اور اپنے ساتھیوں کو مجرموں سے مرعوب نہ ہونے دیتا۔اس کی انہی خوبیوں کی وجہ سے اسے اپنے ساتھیوں میں اہم مقام حاصل تھا۔اور کیپٹن علی کی طرح عامر بھی ملک کی ہر دل عزیز شخصیت تھا۔

عامر تمام مہمات میں کیپٹن علی کے ساتھ ہوتا۔اس کا قابل شاگرد تھا۔کیپٹن علی نے اسے بغیر اسلحہ کی لڑائی کے بہت سے گر سکھا رکھے تھے۔یہ انتہائی خطرناک اور خفیہ قسم کے داؤ تھے۔علی نے یہ فن جاپان میں ''پاتا سیکا'' سے سیکھا تھا۔''پاتا سیکا'' مارشل آرٹس کا مانا ہوا استاد تھا اور دنیا میں اس کے صرف چند شاگرد ہی تھے جن میں علی بھی شامل تھا۔پاتا سیکا کو یہ آرٹ وراثت میں ملا تھا۔اس کے آباؤ اجداد مارشل آرٹس کے بانیوں میں شامل رہے تھے۔

ان دنوں پاتا سیکا جاپان کے ایک دور افتادہ جزیرے میں گوشہ نشینی کی سی حالت میں رہتا تھا۔علی نے اس کی بہت خدمت کی جس کے بدلے میں پاتا سیکا نے اسے وہ اہم داؤ بھی سکھا دیا جو ابھی تک اس کے خاندان سے باہر نہیں نکلا تھا۔اس طرح علی کا شمار ان لوگوں میں ہونے لگا جو مارشل آرٹس کے یہ خفیہ داؤ جانتے تھے۔گو کہ اس داؤ پر عبور حاصل کرنے کیلئے کیپٹن علی کو جان توڑ محنت کرنی پڑی۔اس کا استاد رات گئے تک سردیوں کے موسم میں اسے ٹھنڈے پانی میں تیرنے پر مجبور کرتا۔پھر تیز دھوپ میں صحرا میں دوڑنے کو کہتا۔لیکن محنت اور ریاضت کے بغیر دنیا میں کسی کو کچھ حاصل نہیں ہوتا۔جب پاتا سیکا نے دیکھا کہ اس کا ہونہار شاگرد اس کے معیار پر پورا اتر رہا

ہے تو اس نے ایک روز تنہائی میں بلا کر اسے اپنے اس خاندانی راز سے آگاہ کر دیا۔اس داؤ کا نام ''لی جن پاؤ'' تھا۔

جس کسی کو یہ داؤ آتا وہ نہتا ہونے کے باوجود گولیوں کی بوچھاڑ سے محفوظ رہتا تھا۔پاتا سیکا نے یہ داؤ صرف علی کو سکھایا تھا جس کی وجہ سے اس کے دوسرے شاگرد علی اور پاتا سیکا کے دشمن بھی ہو گئے۔اس داؤ کے بدلے بالآخر بے چارے استاد پاتا سیکا کو اپنی جان سے بھی ہاتھ دھونے پڑے۔اس کے ایک حاسد نے پاتا سیکا کو کھانے میں زہر ملا کر دے دیا جس سے اس کی موت واقع ہو گئی۔ان لوگوں نے کیپٹن علی کو بھی جان سے مارنے کی کوشش کی تھی لیکن وہ محفوظ رہا اور اپنے ملک پہنچ گیا۔

علی اور عامر دونوں مجرموں کی آنکھوں میں کانٹے کی طرح کھٹکتے تھے۔ان پر متعدد قاتلانہ حملے بھی ہو چکے تھے مگر اپنی چالاکی، ہوشیاری اور خوش قسمتی کی وجہ سے وہ اب تک محفوظ چلے آ رہے تھے۔چونکہ یہ لوگ برائی کے خلاف نبرد آزما تھے اس لئے اللہ تعالیٰ بھی ان کی مدد کرتے ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ اچھائی اور نیکی کو پسند فرماتے ہیں۔

عامر چونکہ بہادر ہونے کے ساتھ بڑا ہنس مکھ بھی تھا اس لئے اکثر لوگ اس کی دوستی کے متمنی رہتے تھے۔مگر کچھ وقت کی کمی، پھر کام کا تقاضہ اور پھر اس کی نوکری کے اصول آڑے آتے۔اس لئے وہ صرف چند لوگوں سے ہی تعلقات قائم رکھ سکتا تھا لیکن عامر کے جتنے بھی دوست تھے وہ سب ہی اپنے اپنے فن میں طاق اور اعلیٰ صلاحیتوں کے مالک تھے۔اکثر یوں ہوتا کہ وہ اپنی مہمات کے دوران ان سے کوئی نہ کوئی کام نکال لیتا۔بسا اوقات تو کیپٹن علی بھی اس کے دوستوں سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہتا تھا کیونکہ یہ لوگ بڑے مشکل حالات میں بھی ان کے لئے آسانی کی راہ نکال دیتے۔

ان کے دوستوں کو علم ہوتا تھا کہ وہ کس کی مدد کر رہے ہیں اور اسی کو وہ مادر وطن کی خدمت تصور کرتے تھے۔

کیپٹن علی نے اپنے بعض خفیہ ٹھکانے بنا رکھے تھے جن کا علم ان دونوں کے علاوہ کسی اور کو

نہیں تھا' یا پھر ان کے محکمے کے سربراہ ہی جانتے تھے کہ ان کے ٹھکانے کہاں کہاں ہیں۔ علی اور عامر کو کئی دفعہ دشمن کی نظروں سے اور کئی مرتبہ اپنوں کی نظروں سے چھپ کر بھی کام کرنا پڑتا تھا۔ ایسے مواقع پر یہی ٹھکانے ان کے استعمال میں رہتے تھے۔ ان ٹھکانوں پر ضروریات زندگی کے استعمال کی سب چیزیں اور وائرلیس وغیرہ موجود رہتے تھے تاکہ ضرورت کے وقت وہ کسی سے بھی رابطہ قائم کر سکیں۔

ان خفیہ مقامات کی نگرانی کا کام وہ اپنے ''خفیہ دوستوں'' سے لیا کرتے تھے جو مختلف سوانگ رچا کر یہاں موجود رہتے۔ مثلاً کوئی کسی ٹھکانے پر اگر نجومی کے روپ میں قیام پذیر ہے تو دوسرے کسی ٹھکانے پر کوئی شعبدہ باز بن کر زندگی گزار رہا ہے۔ غرض کسی نہ کسی بھیس میں ان کے یہ خفیہ ساتھی ان ٹھکانوں کی حفاظت پر مامور رہتے تھے۔ اس طرح ایک تو نگرانی کا کام جاری رہتا اور دوسری طرف کسی کو شک بھی نہیں ہوتا کیونکہ یہ لوگ عام شہریوں کی طرح زندگی بسر کرتے تھے۔

کیپٹن علی کا طریقہ کار دوسرے لوگوں سے قدرے مختلف تھا۔ وہ جب تک مجرم کی گردن پر ہاتھ نہ ڈال لیتا' اپنے آپ کو سامنے نہیں لاتا تھا اور خود کو اس وقت ظاہر کرتا جب سے یقین ہو جاتا کہ اب مجرم بچ کر نہیں جا سکتے۔ اس کے اسی طریق کار کی بناء پر محکمے میں بھی اس کی مخالفت ہوتی رہتی تھی' لیکن اس کے مخالف اس لئے کبھی کامیاب نہ ہوتے کہ کیپٹن علی کبھی ناکام نہیں ہوا تھا۔ اس کی کامیابی کی وجہ سے کسی کو کھل کر اس کی مخالفت کرنے کی جرات نہ ہوتی۔ بلکہ کئی ایسے لوگ جو پہلے اس طریق کار کی وجہ سے اس کے مخالف تھے' اب اس کے موافق ہونے لگے تھے۔

ان کے تیسرے ساتھی کا نام ٹیپو تھا۔

ٹیپو نو عمر تھا۔ بچپن میں یتیم ہو گیا۔ اس کی پرورش کیپٹن علی نے کی۔ ایک تو کیپٹن علی کی تربیت' پھر اس کی خداداد صلاحیتیں۔ ٹیپو کو دیکھ کر کوئی یقین نہیں کر سکتا تھا کہ اس عمر کا بچہ ایسے ایسے خطرناک کام بھی کر سکتا ہے۔ کہنے کو تو وہ بچہ تھا لیکن اس کے کارنامے بڑے بڑوں کو حیرت میں ڈال دیتے تھے۔ کیپٹن علی نے اسے کم عمری ہی سے مارشل آرٹس سکھانے شروع کر دیئے تھے۔ عامر کی طرح کیپٹن علی کے لئے ٹیپو بھی قابل فخر تھا۔

علی' عامر اور ٹیپو تینوں ایک ہی جگہ رہتے تھے۔ ان کا عارضی ٹھکانہ دارالحکومت کے نزدیک ایک انتہائی اہم مقام پر تھا۔ اس علاقے میں ملک کی مقتدر ہستیاں قیام پذیر تھیں۔ یہ لوگ بھی ان تاجروں کی حیثیت سے قیام پذیر تھے۔ کسی کو انکی اصلیت کا علم نہ تھا۔ ان کی ذمہ داریوں پوشیدہ رکھیں کیونکہ بسا اوقات دشمن اپنے آدمیوں کو بھی ان کے خلاف استعمال کر لیا کرتا تھا۔

اس آبادی میں ان کی رہائش کے متعلق ان کے محکمے کے سربراہ یا پھر ملک کی اہم شخصیات کو علم تھا۔ خود ان کے ماتحت بھی نہیں جانتے تھے کہ کیپٹن علی کہاں رہتے ہیں۔

☆☆☆☆☆

آئی جی صاحب جانتے تھے کہ علی ان واقعات سے لاتعلق نہیں رہ سکتا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ اس نے اس میں کچھ پیش رفت بھی کر لی ہے۔

خط ان لوگوں کے سامنے رکھا تھا۔ خط ٹائپ کیا گیا تھا اور یہی اس بات کا ثبوت تھا کہ ملزم بہت ہوشیار ہیں۔ وہ کوئی بھی ثبوت ان لوگوں کے لئے چھوڑنا نہیں چاہتے تھے۔

''اف میرے خدایا! صبح کے اخبارات تو سارے شہر میں کہرام مچا دیں گے۔ لوگ تو پہلے ہی پولیس سے بہت نالاں ہیں۔'' آئی جی صاحب نے اپنی تشویش ظاہر کی۔

''ٹھیک ہے۔ لیکن یہ بھی تو مناسب نہیں کہ اخبارات کو اس خبر کی اشاعت سے روک دیا جائے، کیونکہ اس طرح تو افواہیں اور زیادہ پھیلیں گی اور لوگ اور زیادہ پریشان ہوں گے۔'' کیپٹن علی نے کہا۔

''تم بالکل درست کہتے ہو علی! اور کوئی خاص بات بھی سمجھ میں آتی ہے؟'' آئی جی نے پوچھا۔

''سوائے اس کے اور کوئی بات نہیں کہ اغوا ہونے والے چاروں بچے کروڑ پتی والدین کے ہیں اور چاروں اپنے والدین کی اکلوتی اولاد ہیں۔ مجرموں نے بہت منصوبہ بندی کے بعد ایسے بچے تلاش کیے ہیں۔ وہ والدین کی کمزوری سے فوری فائدہ اٹھانا چاہتے ہوں گے'' عامر قریب سے بولا۔

''میرے خیال سے انکل ایک اور بات بھی ہے۔'' ٹیپو نے گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا۔

''کیا بیٹے؟''

''ملزموں کا کوئی ساتھی ان سکولوں میں بھی موجود ہے جس نے انھیں نہ صرف بچوں کے کوائف مہیا کیے بلکہ ان کے معمولات سے بھی آگاہ کیا ہے۔''

''شاباش!'' مسٹر آفریدی بولے۔ ''بھئی کیپٹن علی تمہارا یہ شاگرد ضرور نام پیدا کرے گا۔''

''جی ہاں!'' عامر نے بظاہر جلے کٹے الفاظ میں کہا۔ ''ہم تو جھک ہی مار رہے ہیں۔''

اس کی بات پر آئی جی صاحب کے ہونٹوں پر بے اختیار مسکراہٹ پھیل گئی۔

چاروں رات گئے تک کیس کے مختلف پہلوؤں پر بات کرتے رہے۔ پھر آئی جی صاحب چلے گئے۔ مسٹر آفریدی کی روانگی کے فوراً ہی بعد کیپٹن علی نے محکمہ ٹیلی فون کے ڈائریکٹر کا نمبر ملایا۔ اس وقت رات کے قریباً گیارہ بج رہے تھے۔ ڈائریکٹر صاحب اس کے دوستوں میں شمار ہوتے تھے اور انہوں نے علی کے لیے اکثر کام کیے تھے۔ کیپٹن علی نے انہیں مختصر صورت حال بتا کر ان سے درخواست کی کہ وہ اغواء ہونے والے چاروں بچوں کے گھروں کے ٹیلی فون نمبروں پر ہونے والی گفتگو کو ٹیپ کرنے کا بندوبست کریں۔

اس طرح علی یہ چاہتا تھا کہ وہ اغوا کرنے والوں اور بچوں کے لواحقین کے درمیان ہونے والی گفتگو سے باخبر رہ سکے کیونکہ جس نوعیت کی دھمکیاں ان لوگوں کو ملی تھیں اس کے بعد ان سے یہ امید رکھنا غلط تھا کہ وہ لوگ مجرموں کو ناراض کر کے پولیس سے تعاون کریں گے۔

کیپٹن علی نے ایسا انتظام کر لیا تھا کہ ان لوگوں کے ساتھ ہونے والی گفتگو کے فوراً ہی بعد اس کی تفصیلات اسے مل سکتی تھیں۔ اس کام کے لئے اس نے اپنے محکمہ خفیہ کے دو آدمیوں کو ٹیلی فون آپریٹروں کے روپ میں وہاں روانہ کر دیا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ محکمے کے لوگوں کو بھی کسی بات کی کانوں کان خبر ہو۔

گفتگو ختم کر کے اس نے ٹیلی فون رکھا ہی تھا جب عامر کو باہر نکلنے کی سوجھی۔

''کہاں کے ارادے ہیں جناب؟'' اس نے عامر کو مخاطب کیا۔

''ظاہر ہے رات کے بارہ بجے سونے ہی جاؤں گا۔ اس وقت کنویں میں چھلانگ لگانے یا ں پر مٹرگشت کرنے سے تو رہا۔'' اس نے جمائی لیتے ہوئے کہا۔

میرے خیال میں فی الوقت آپ سونے کا پروگرام ملتوی ہی کر دیں'' علی نے کہا۔

''جی نہیں! میرے لیے یہ ممکن نہیں۔ اللہ نے رات سونے اور دن جاگنے کے لئے بنایا ۔'' عامر نے بظاہر برا سا منہ بنا کر کہا۔

''ٹھیک ہے، پانی موجود ہے۔ اگر تم بستر پر نہانا چاہتے ہو تو تمہاری مرضی!'' کیپٹن علی نے ی طرف دیکھے بغیر دل ہی دل میں مسکراتے ہوئے کہا۔

''کمال ہے! آپ ایک اصولی بات کو غلط قرار دینے پر تلے ہوئے ہیں۔'' عامر نے چاہا کہ رے سے باہر نکل جائے لیکن کیپٹن علی نے اس کی گردن پر ہاتھ رکھ کر اس کا رخ اپنی طرف رتے ہوئے کہا:

''اسی وقت سیٹھ رمضان کی کوٹھی کی طرف روانہ ہو جاؤ۔ مجرموں کیلئے سب سے موٹی امی وہی ہے اور وہ اس سے غافل نہیں ہوں گے۔ ضرور کوئی نہ کوئی ان کے گھر کی نگرانی کر رہا ہو ۔''

''ٹھیک ہے!'' عامر نے جلے کٹے لہجے میں کہا اور ہنستا ہوا باہر نکل گیا۔

علی جانتا تھا کہ عامر معمول کے مطابق صرف اداکاری کر رہا ہے ورنہ کام سے جی چرانا تو انے سیکھا ہی نہیں تھا۔

عامر نے اپنی کار سیٹھ رمضان کی کوٹھی سے کچھ فاصلے پر پارک کی تھی اور اب پیدل ہی اس رف جا رہا تھا۔ یہ اس شہر کا بہت ماڈرن علاقہ تھا لیکن اس میں دور دور تک کوئی ذی ہوش دکھائی ں دے رہا تھا۔ کبھی کبھی کسی کونے سے کسی چوکیدار کی آواز ضرور سنائی دے جاتی تھی۔ عامر ب کی نظروں سے بچ کر سیٹھ رمضان کی کوٹھی تک آ گیا تھا۔

سیٹھ صاحب کی خوب صورت کوٹھی اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھی۔ برآمدے میں صرف ب بلب روشن تھا۔ عامر نے کچھ فاصلے پر رک کر صورت حال کا جائزہ لیا۔ پھر وہ دبے پاؤں چلتا

کوٹھی کے دروازے تک آ گیا۔ ادھر ادھر نظریں دوڑانے پر جب اسے کوئی دکھائی نہ دیا تو عامر نے کوٹھی کے باہر خوب صورتی کے لئے بنائے گئے باغیچے میں چھپ کر بیٹھنے کا فیصلہ کر لیا۔ باغیچے میں لگے سفیدے کے درختوں کے پیچھے اس نے خود کو دروازے کی طرف آنے والوں کی نظروں سے محفوظ رہنے کے لئے چھپا لیا اور اپنی نظریں سامنے سڑک پر گاڑ دیں۔۔

ابھی عامر کو وہاں بیٹھے بمشکل دو تین منٹ ہی گزرے تھے کہ جب اس کی چھٹی حس نے اسے باغیچے سے ملحق کوٹھی کی بیرونی دیوار کے اندر کسی کے حرکت ہونے کی اطلاع دی۔ عامر محتاط ہو کر بیٹھ رہا، اپنی نظریں کوٹھی کی دیوار کے ساتھ باہر کو لٹکتی بیل پر جمار کھی تھیں جب اسے بیل ہلتی دکھائی دی۔ شاید کوئی اس طرف سے دیوار کے ذریعے باہر آنے کی کوشش کر رہا تھا۔

عامر سنبھل کر بیٹھ گیا۔

دوسرے ہی لمحے اس نے ایک سائے کو کمپاؤنڈ کی دیوار پھلانگ کر باغیچے میں چھلانگ لگاتے دیکھا۔ سایہ پکے ہوئے پھل کی طرح اس کے قریب ہی گرا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ اٹھ کر کھڑا ہو، عامر نے اپنا ہاتھ آگے نکالا اور ایک زوردار ضرب اس کی کنپٹی پر لگا دی۔ سایے کے لئے اس کا ایک ہی ہاتھ کافی تھا۔ وہ شخص منہ سے ہلکی سی چیخ نکال کر بے ہوش ہو گیا۔ عامر نے پھرتی سے اسے باغیچے میں لگی باڑ کے نزدیک گھسیٹ لیا۔ اب اس پر کوئی نظر نہیں پڑ سکتی تھی۔

عامر چوکنا ہو کر بیٹھا رہا۔ اسے امید تھی کہ اس کا شاید کوئی ساتھی بھی یہاں موجود ہو گا۔ پندرہ بیس منٹ تک وہ اسی پوزیشن میں بیٹھا رہا لیکن کوٹھی کے اندر یا باہر جب کوئی حرکت نہ ہوئی تو اس نے اپنے ''شکار'' کو کندھے پر اٹھایا اور سڑک کے کنارے لگے درختوں کی اوٹ میں چلتا اپنی کار تک آ گیا۔ جس سے اس نے اپنے شکار پر ضرب لگائی تھی، اسے یہی امید تھی کہ ایک گھنٹہ تک وہ ہوش میں نہیں آئے گا۔ کار کا دروازہ کھلتے وقت جو ہلکی سی روشنی پیدا ہوئی تھی، اس روشنی میں عامر نے اپنے شکار کے چہرے پر ایک طائرانہ سی نظر دوڑائی تھی۔ پینتیس چالیس سال کی عمر کا یہ شخص شکل سے خاصا شریف ہی دکھائی دے رہا تھا۔

☆☆☆☆☆

پچھلا دروازہ لاک کر کے اس نے گاڑی کا انجن سٹارٹ کر دیا اور دوسرے ہی لمحے وہ اپنی کار میں لگے وائرلیس پر کیپٹن علی سے مخاطب تھا، اس وقت رات کے دو بج رہے تھے۔ کیپٹن علی اپنے ہیڈ کوارٹر میں موجود تھا۔ اس کی یہ عادت تھی کہ وہ اپنے ساتھیوں کو کسی بھی مہم پر بھیج کر ان سے لاتعلق نہیں رہتا تھا بلکہ نگرانی کے لئے خود بھی ہیڈ کوارٹر میں موجود رہتا۔ اس نے باقی لوگوں کے گھروں پر بھی اسی طرح اپنے ماتحتوں کو خفیہ نگرانی کے لئے مقرر کیا تھا لیکن کسی کامیابی کی اطلاع اسے صرف عامر کی طرف سے ہی موصول ہوئی تھی۔

عامر کار کو صحیح معنوں میں اڑاتا ہوا یہاں تک لایا تھا۔ ہیڈ کوارٹر کا دروازہ اس کی گاڑی کو پہچاننے پر کھول دیا گیا۔ کار وہ برآمدے تک لے آیا تھا۔ برآمدے میں سب سے پہلے اس کی نظر کیپٹن علی پر ہی پڑی تھی۔ عامر تیزی سے اتر کر باہر آیا اور پچھلی سیٹ کا دروازہ کھولا۔

''ہیں! یہ کیا!'' بے اختیار اس کے منہ سے نکلا۔

پچھلی سیٹ خالی تھی۔ عامر کا منہ تو کھلے کا کھلا رہ گیا۔ سیٹھ صاحب کی کوٹھی سے یہاں پہنچنے تک اس نے تین چار موڑ ضرور کاٹے تھے اور ہر موڑ پر اسے گاڑی کی رفتار بھی بہت آہستہ کرنی پڑی تھی لیکن یہ بات تو اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں آ سکتی تھی کہ اس کا شکار کسی ایسے ہی موڑ پر اسے جل دے کر نکل گیا ہو گا۔ وہ تو ابھی تک اسے بے ہوش ہی سمجھ رہا تھا۔ عامر سٹپٹا کر رہ گیا۔

وہ بڑا حاضر دماغ اور بات بات میں مزاح پیدا کرنے والا زندہ دل آدمی تھا۔ ایسے مواقع پر ایک آدھ فقرہ بول کر وہ دل کا غبار بھی ضرور ہلکا کر لیا کرتا تھا لیکن اس حادثے نے تو اسے چکرا کر ہی رکھ دیا تھا۔ وہ ہونقوں کی طرح کیپٹن علی کا منہ دیکھتا رہا جس کے چہرے پر ہمیشہ کی طرح مسکراہٹ تھی۔ علی بغیر کچھ کہے کمرے میں واپس آ گیا۔ عامر بھی اس کے تعاقب میں اندر آ گیا۔

''کوئی بات نہیں۔ کبھی کبھی یوں بھی ہو جاتا ہے۔'' اس نے عامر کا دل بڑھایا۔ عامر صرف مسکرا کر رہ گیا۔

اتنے میں فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ کیپٹن علی نے آگے بڑھ کر فون اٹھایا۔ دوسری طرف کیپٹن ناصر اس سے مخاطب تھا۔ اس نے کیپٹن علی کو تھوڑی ہی دیر پہلے سیٹھ رمضان اور تنویر کو اغوا کرنے

والوں کے درمیان ہونے والی گفتگو کا ٹیپ سنا دیا۔

''ٹھیک ہے! تم یہیں رہو۔'' علی نے اسے ہدایت دیکر فون بند کر دیا۔

''میرے خیال میں اب گھر چلنا چاہیے۔'' اس نے تھوڑی دیر بعد عامر کو مخاطب کیا جو ایک کونے میں دھری کرسی پر سکڑا سمٹا بیٹھا تھا۔

''اچھا! کمال ہے! آپ کو گھر کا خیال آ گیا۔ حالانکہ اب صبح ہونے میں ایک دو گھنٹے ہی باقی رہ گئے ہیں۔'' عامر نے جلے کٹے لہجے میں کہا۔

''میں نے سوچا تم تھک گئے ہو گے۔ بھئی تمہارے آرام کا خیال بھی تو آخر رکھنا ہوتا ہے۔'' کیپٹن علی نے اسی لہجے میں جواب دیا۔

''یقین نہیں آ رہا۔'' عامر نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ ''اب چلو گے بھی یا.....''

علی نے اس کی کمر پر دھول جمائی۔ دونوں باہر نکل آئے۔

☆☆☆☆☆

سیٹھ رمضان کے علاوہ دوسرے اغوا ہونے والے بچوں کے گھروں کی نگرانی بھی مسلسل کی جا رہی تھی، لیکن ابھی تک پولیس کو کام کی ایک بات کا بھی علم نہیں ہو سکا تھا۔ تفتیش جہاں سے شروع ہوئی تھی، گاڑی وہیں پر رکی رہی، خفیہ پولیس کے لوگوں نے اغوا ہونے والے بچوں کے والدین کے گھروں اور دفاتر کے گرد نگرانی کا جال بن رکھا تھا۔ ان کے ٹیلی فون مسلسل ٹیپ کیے جا رہے تھے لیکن کوئی نتیجہ نہیں نکل رہا تھا۔

کیپٹن علی کو پریشانی اس بات کی تھی کہ ابھی تک اگر کوئی شکار بھی ہاتھ لگا تھا تو وہ نکل گیا تھا۔ معاملہ خاصا سیریس ہو رہا تھا کیونکہ اغوا ہونے والے تمام بچوں کے والدین بڑے اثر و رسوخ کے مالک تھے۔ انہوں نے اعلیٰ حکام تک رسائی حاصل کر لی تھی اور اب پولیس پر اعلیٰ حکام زبردست دباؤ ڈال رہے تھے کہ ملزموں کو جلد از جلد گرفتار کر کے بچوں کو برآمد کیا جائے۔ لیکن پولیس کے لاکھ سر کھپانے کے باوجود مجرموں کا نام و نشان بھی دکھائی نہ دیتا تھا۔

☆☆☆☆☆

سیٹھ رمضان رات ایک لمحے کے لئے بھی نہیں سو پائے تھے۔ بمشکل تھوڑی دیر کے لئے صبح ان کی آنکھ لگی تھی۔ انہوں نے فون اپنے بیڈ روم ہی میں اپنے سرہانے رکھا ہوا تھا کہ ان کے علاوہ کوئی دوسرا فون نہ سن سکے۔ ابھی ان کی آنکھ لگی ہی تھی جب اچانک فون کی گھنٹی چلا اٹھی۔ سیٹھ رمضان ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے۔ ان کے دل کی دھڑکن اچانک ہی تیز ہو گئی تھی۔ کپکپاتے ہاتھوں سے انہوں نے فون کا ریسیور اٹھایا اور بمشکل ہیلو کہا۔

''سیٹھ کیسے مزاج ہیں؟'' دوسری طرف سے مانوس آواز سنائی دی۔

''دیکھو، خدا کے لئے میرے بچے کا پیچھا چھوڑ دو۔ آج کل میرے حالات ایسے نہیں کہ تمہیں زیادہ رقم دے سکوں۔ کچھ کمی کرو۔ میرے حال پر رحم کرو!'' انہوں نے بمشکل کہا۔

''سیٹھ اصول کے مطابق تو ہمیں آپ کے بیٹے کو اب تک ختم کر دینا چاہیے تھا۔ کیونکہ آپ نے وہ خط پولیس کو پہنچا دیا ہے۔ سیٹھ یہ کبھی نہ بھولنا کہ ہمارے ہاتھ بہت لمبے ہیں۔ ہمارے آدمی پولیس ڈیپارٹمنٹ میں بھی موجود ہیں۔ وہ ہمیں پل پل کی خبر دیتے ہیں۔ سمجھے!'' دوسری طرف سے ہونے والی بات نے تو سیٹھ کے اوسان ہی خطا کر دیتے تھے۔

''یہ بالکل غلط ہے۔ تم جھوٹ کہہ رہے ہو۔ میں نے کوئی خط نہیں دکھایا۔'' سیٹھ نے گھبراتے ہوئے کہا۔

''سیٹھ! تم ہماری آنکھوں میں دھول نہیں جھونک سکتے۔ ہمیں علم ہے کہ آئی جی رات تمہارے گھر آئے تھے۔''

''وہ میرے دوست ہیں۔ بغیر پروگرام کے ملنے آئے تھے۔ وہ تو آتے ہی رہتے ہیں'' سیٹھ نے اندازہ لگا لیا ان لوگوں نے پہلی بات اندازے سے کہی تھی۔ وہ اس کے منہ سے اگلوانا چاہتے تھے۔

''ٹھیک ہے!'' دوسری طرف سے کچھ خاموشی کے بعد کہا گیا۔ ''تمہاری بہتری بھی اسی میں ہے۔ اور ہاں۔ یہ ہماری آخری وارننگ ہے۔ اس کے بعد کسی بھی خطرناک اقدام کی ذمہ داری تم پر عائد ہو گی۔''

''اچھا، اچھا! فون بند نہ کرنا۔ بتاؤ مجھے روپے کہاں پہنچانے ہوں گے''۔

''شاباش! یہ ہوئی نا کام کی بات۔ ٹھیک ہے تمہیں ادائیگی کا طریقہ بھی بتا دیا جائے گا۔ لیکن یاد رکھنا تمہاری ذرا سی چالاکی تمہارے بچے کی جان لے لے گی۔'' دوسری طرف سے دھمکی دی گئی۔

سیٹھ ہیلو ہیلو ہی کہتا رہ گیا لیکن سلسلہ منقطع ہو چکا تھا۔

☆☆☆☆☆

سینٹ مائیکل اس شہر میں اپنی نوعیت کا واحد تعلیمی ادارہ تھا جہاں امراء اور بڑے بڑے سرکاری افسروں کے بچے تعلیم حاصل کر سکتے تھے۔ پیٹرک اس سکول میں کلرک تھا۔ یہ سکول ایک عیسائی مشنری چلا رہی تھی۔ یہ سکول جہاں اپنی اعلیٰ تعلیمی روایات کے متعلق شہرت رکھتا تھا وہاں عوام میں اس کے متعلق بڑی عجیب وغریب افواہیں بھی پھیلتی رہتی تھیں۔

اس سلسلے میں اکثر اخبارات میں گمنام خط اور ٹیلی فون آیا کرتے تھے جس میں اس سکول کے سٹاف سے متعلق عجیب وغریب باتیں کہی جاتی تھیں۔

اس سلسلے میں ابھی تک پولیس نے کوئی قدم نہیں اٹھایا تھا۔ پولیس کو بھی علم تھا کہ یہاں بڑے بڑے افسروں اور ملک کے امیر ترین لوگوں کے بچے تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ اگر انکوائری شروع کی گئی تو کہیں لینے کے دینے ہی نہ پڑ جائیں۔ گو کہ اس معاملے میں اکثر پولیس افسر ہاتھ ڈالتے ہوئے ڈرتے تھے لیکن بطور احتیاط اس سلسلے میں پولیس ہیڈ کوارٹر میں ایک الگ فائل ایس ایس پی نے کھول رکھی تھی۔ یہ فائل عموماً وہ اپنے پاس ہی رکھا کرتے تھے اور کسی کو نہیں دکھاتے تھے۔ اس فائل میں وہ تمام گمنام خطوط لگائے گئے تھے جو اس سکول میں کام کرنے والی مشنری ملازمین کی شکایات سے متعلق تھے۔

کیپٹن علی کی ایس ایس پی سے ذاتی دوستی تھی۔ دونوں کالج کے زمانے میں اکٹھے ہی کرتے تھے اور اب بھی ایک دوسرے کے ساتھ اکثر معاملات میں تعاون کرتے تھے۔ علی کو بات کا علم تھا کہ ایس ایس پی نے یہ فائل اپنے قبضے میں رکھی ہوئی ہے اور وہ کسی کو نہیں دکھاتے

نے ان سے یہ فائل لے کر ایک ایک خط کو غور سے پڑھا پھر ایک نام پر اس کا ذہن اٹک کر رہ گیا۔ یہ نام تھا پیٹرک۔

☆☆☆☆☆

پیٹرک کا تعلق کسی دوسرے ملک سے تھا اور وہ اپنی مشنری کی طرف سے یہاں تعینات تھا۔ پولیس کو موصول ہونے والے اکثر خطوط میں پیٹرک کی پراسرار سرگرمیوں کی اطلاعات دی گئی تھیں۔ اس سکول کے بچے چونکہ اغوا ہو چکے تھے۔ علی نے کچھ سوچتے ہوئے اور اپنے ذہن میں اندازہ قائم کر کے کہ ضرور اغوا کرنے والوں کا کوئی ساتھی سکول کے سٹاف میں موجود ہے، پیٹرک کو چیک کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اس نے ٹیپو کو پیٹرک کی نگرانی پر لگا دیا۔

پیٹرک اپنے سکول کے نزدیک ہی ایک کینٹین پر اکثر چائے پینے آیا کرتا تھا۔ آج بھی وہ یہاں بیٹھا تھا لیکن اس بات سے بے، بر کہ اس سے تھوڑے فاصلے پر موجود ٹیپو اس کی نگرانی کر رہا ہے۔ ٹیپو کو آج یہاں آئے ہوئے تیسرا دن تھا۔ گزشتہ دو روز سے وہ صرف پیٹرک کو یہاں آتے اور جاتے دیکھ رہا تھا لیکن ابھی تک کسی مشتبہ آدمی کو اس نے پیٹرک کے نزدیک پھٹکتے نہیں دیکھا تھا۔ اس صورت حال نے اسے کچھ مایوس بھی کیا لیکن اسے یقین تھا کہ علی کا وار کبھی خالی نہیں جایا کرتا۔ آج خلاف معمول پیٹرک کو یہاں بیٹھے کچھ زیادہ ہی دیر ہو گئی تھی ٹیپو نے اندازہ لگایا جیسے وہ کسی کا منتظر ہو۔ اس کی چھٹی حس نے کسی آنے والے خطرے کی نشان دہی کر دی تھی۔

ٹیپو چوکنا ہو کر بیٹھ گیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد اس نے ایک شخص کو کینٹین میں داخل ہو کر اس میز کی طرف بڑھتے دیکھا جس پر پیٹرک بیٹھا تھا۔ دونوں ایک دوسرے سے بظاہر اجنبی بنے بیٹھے رہے لیکن ٹیپو نے اندازہ لگا لیا کہ ضرور دال میں کچھ کالا ہے۔ ورنہ یہاں اور خالی میزیں بھی تھیں وہ شخص وہاں بھی بیٹھ سکتا تھا۔ پھر اس نے دیکھا کہ دونوں نے بڑی چالاکی سے ایک دوسرے کے ساتھ اپنے پاس پہلے سے موجود لفافوں کا تبادلہ بھی کر لیا تھا۔ ان کی اس حرکت کو ٹیپو کے علاوہ اور کسی نے نوٹ نہیں کیا تھا اور کسی کو ضرورت بھی کیا تھی اس طرف دیکھنے کی۔

نووارد نے چائے ختم کر لی تھی اور وہ بیرے کو بل ادا کرنے کے بعد اٹھنے کے لئے پر تول رہا

تھا۔ ٹیپو کو کیپٹن علی نے جو خاص تربیت جیب صاف کرنے کی دی تھی اسے آزمانے کا وقت آ گیا تھا۔ وہ اٹھ کر دروازے کے نزدیک پہنچ گیا۔

جو کچھ بھی تھا اس لفافے میں بند تھا جو اس وقت نووارد کی جیب میں موجود تھا اور اسے یہ لفافہ غائب کرنا تھا۔ کینٹین کے دروازے سے باہر وہ اجنبی پر نظریں جمائے اس بات کا منتظر تھا کہ جیسے ہی موقع ملے اپنا کام دکھا جائے۔

پھر اس نے پیٹرک کے ساتھی کو اپنی جگہ سے اٹھ کر دروازے کی طرف آتے دیکھا۔ ٹیپو دروازے سے باہر نکلا۔ پھر اچانک ایسے اندر داخل ہوا جیسے کوئی شے اندر بھول آیا ہو۔ اس اثناء میں وہ اچانک نووارد سے ٹکرایا اور اسے احساس بھی نہ ہو سکا کہ اس کی جیب سے ٹیپو نے بڑی ہوشیاری سے وہ پرس اڑا لیا ہے جس میں اس نے لفافہ رکھا ہے۔ ٹیپو اس سے معذرت کرتا ہوا دروازے سے باہر نکل گیا۔

اس اثناء میں شاید نووارد کو اپنے لٹنے کا احساس ہو گیا تھا کیونکہ ٹیپو نے اچانک ہی اس کے چلانے کی آوازیں سنیں۔ ''چور، چور! پکڑو، پکڑو!''

ٹیپو کو احساس تھا کہ یہ صورت حال بھی پیش آ سکتی ہے۔ اس نے اس سے نمٹنے کی پہلے ہی سے تیاری کر رکھی تھی اور یہاں سے فرار کے تمام راستوں کا جائزہ لے لیا تھا۔ لوگوں کو اپنی سمت آتے دیکھ کر اس نے اپنا رخ بدلا اور نزدیکی گلی میں گھوم گیا۔ پھر وہ مختلف گلیوں میں چکر لگاتا رہا۔ جلد ہی وہ اپنے تعاقب میں آنے والوں کی آنکھوں میں دھول جھونکنے میں کامیاب ہو گیا۔ چند منٹ کے بعد ہی وہ اپنے ایک خفیہ ٹھکانے پر موجود تھا یہاں کیپٹن علی اور عامر پہلے ہی سے اس کے منتظر تھے کیونکہ ٹیپو کی نگرانی پر بھی کیپٹن علی نے ایک اور آدمی کو لگا رکھا تھا جس نے ٹیپو کے اس ''کارنامے'' کی اطلاع انہیں پہنچا دی تھی اور انہیں علم تھا کہ ٹیپو سیدھا اسی طرف آئے گا۔ سب سے پہلے تو دونوں نے اسے اس کارنامے پر مبارک باد دی، پھر پرس سے لفافہ نکال کر علی نے چاک کیا اندر سے جو تحریر برآمد ہوئی وہ کچھ یوں تھی:

''باس!

ایک اور موٹی اسامی کا پتہ لکھ رہا ہوں۔ (نیچے پتہ درج تھا) یہ بھی آپ کے لئے سونے کی کان ثابت ہوگی۔ امید ہے کہ آپ میری خدمات سے خوش ہوں گے۔ اب حالات ٹھیک ہونے تک مجھ سے رابطہ نہ کیا جائے، کیونکہ ممکن ہے سی آئی ڈی والے میری نگرانی شروع کروا دیں۔

آئندہ سکول میں کوئی مجھ سے ملنے کی کوشش نہ کرے۔ اگر ضروری ہو تو مجھ سے گھر پر رابطہ قائم کیا جا سکتا ہے۔

پیٹرک!

''شکر ہے خدا کا! کوئی سرا تو ہاتھ لگا۔'' علی نے خط پڑھ کر سکون کا لمبا سانس لیا۔

اس کا اندازہ درست ہی نکلا تھا۔ اس نے ٹیپو کو تازہ ہدایات دے کر پیٹرک کے گھر کی نگرانی کرنے کے لئے کہا اور ٹیپو وہاں سے پیٹرک کے گھر کی طرف چل دیا۔ اسے اب بھیس بدل کر اس کے گھر کی نگرانی کرنی تھی۔

☆☆☆☆☆

کیپٹن علی کو دوسری امید اب سیٹھ صاحب کے فون کی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ جلد ہی مجرم سیٹھ کو پیسے لانے کے لیے فون کریں گے۔ اس کے ساتھ ہی اس نے عامر کو سیٹھ صاحب کی کوٹھی کی طرف نگرانی کے لیے روانہ کر دیا۔ رات گئے عامر واپس لوٹ آیا۔ اس نے اپنی جگہ اپنے محکمے کے ایک اور ساتھی کو ڈیوٹی پر لگا دیا تھا۔ کیپٹن علی اس وقت اپنے کمرے میں اغوا ہونے والے بچوں کے والدین کے ساتھ ہونے والی مجرموں کی گفتگو سن رہا تھا جب عامر اندر داخل ہوا۔

اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا، علی نے انگلی کے اشارے سے اسے خاموش ہونے کے لیے کہا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے ٹیپ کی آواز اونچی کر دی۔ یہ سیٹھ رمضان اور تنویر کو اغوا کرنے والوں کے ساتھ فون پر ہونے والی گفتگو کا ٹیپ تھا جس میں ملزموں نے سیٹھ صاحب کو فون پر اطلاع دی تھی کہ وہ ایک بریف کیس میں پیسے رکھ کر دوسرے روز علی الصبح شکرال کے پہاڑی سلسلے میں پہنچ جائیں۔ انہیں کہا گیا تھا کہ باقی ہدایات آپ کو وہیں ملیں گی۔

شکرال کی پہاڑیاں شہر سے قریباً 40 میل دور واقع تھیں۔ پہلے تو سیٹھ صاحب نے یہی

سوچا کہ وہ اس فون کی اطلاع پولیس کو دیں لیکن انہوں نے پھر اپنا ارادہ تبدیل کرلیا کیونکہ نوید ان کا اکلوتا بیٹا تھا اور وہ اس کی زندگی کے لئے کسی بھی قسم کا خطرہ مول لینے کو تیار نہیں تھے۔ انہوں نے بادل نخواستہ اکیلے ہی شکرال کی طرف جانے کا ارادہ کرلیا تھا۔ انہیں ڈر تھا کہ اگر ملزموں کو ذرا سا بھی شک ہوگیا تو وہ نوید کو جان سے مار ڈالیں گے۔

ٹیپ کا سوئچ آف کر کے علی نے عامر سے کہا:

''تم فوراً ایک ٹیم لے کر شکرال کی پہاڑیوں میں پھیل جاؤ۔

اس بات کا خیال رہے کہ یہ تمہارے لیے بالکل آخری موقع ہے۔ بہت احتیاط سے کام لینا۔'' اس نے عامر سے کہا۔

''بس جناب! اب کچھ اور نہ کہیے۔ مجھے پہلے ہی بہت غصہ آ رہا ہے''۔ یہ کہہ کر عامر باہر نکل آیا۔

کیپٹن علی جانتا تھا کہ ملزم کوئی کچی گولیاں نہیں کھیلے ہوئے۔ وہ بچے نہیں تھے، بڑے تربیت یافتہ لوگ تھے اور اس بات کا انہیں احساس تھا کہ ان کی سیٹھ کے ساتھ ہونے والی گفتگو ریکارڈ کی جا رہی ہے۔ اس لیے اس بات کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کہ وہ سیٹھ کو اسی جگہ لے جاتے جہاں انہوں نے فون پر کہا تھا۔ اسے احساس تھا کہ اگر ملزم بالکل ہی بے وقوف نہ ہوئے تو وہ جگہ ضرور بدلیں گے۔

اس نے عامر اور دوسرے لوگوں کو ڈرامے میں حقیقت کا رنگ بھرنے کے لیے شکرال کی طرف روانہ کر دیا تھا تاکہ ملزم بھی مطمئن ہو جائیں۔ لیکن وہ خود اب ایک اہم مہم سرانجام دینے جا رہا تھا۔

رات کا دوسرا پہر تھا اور اس کا رخ سیٹھ رمضان کی کوٹھی کی طرف تھا۔ اسے اس بات کا یقین تھا کہ سیٹھ کی کوٹھی کی نگرانی بھی ملزموں کے ساتھی کر رہے ہیں کیونکہ وہ سیٹھ کی سرگرمیوں کو نظر انداز نہیں کر سکتے تھے۔ کیپٹن علی بھی اس موقع کو کھونا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے آگ میں کود جانے کا خطرناک فیصلہ کرلیا تھا۔

شکرال کی پہاڑیاں بڑی پرفضا تھیں۔ شہر سے لوگ تفریح کرنے اور پکنک منانے اس طرف آیا کرتے تھے لیکن شام ڈھلے یہاں خاموشی طاری ہو جاتی تھی کیونکہ دن غروب ہونے سے پہلے سب واپس شہر کو لوٹ جایا کرتے تھے۔ لیکن آج خلاف معمول شام ڈھلے ایک جیپ اس طرف کو جاتی دکھائی دے رہی تھی۔ اس جیپ میں عامر اور اس کے ساتھی بجلی کے محکمے کے ملازمین کے روپ میں موجود تھے۔ انہوں نے یہاں تک پہنچنے کے لیے یہ روپ اختیار کیا تھا تاکہ کسی کو شک نہ گزرے۔

جیپ انہوں نے کچھ دور ہی درختوں کے جھنڈ میں چھپا دی۔ انسپکٹر ناصر جیپ میں وائرلیس پر موجود تھا اور عامر کی نگرانی میں باقی تمام لوگ دور دور تک پھیل گئے۔ گو کہ اصلی کھیل کو شروع ہونے میں ابھی بہت دیر باقی تھی مگر وہ ابھی سے چوکنے ہو کر بیٹھ رہے۔۔

ملزم بڑے ہوشیار معلوم ہوتے تھے۔ انہوں نے سیٹھ کو بڑا عجیب و غریب اور صبح کا وقت دیا تھا۔ عامر کو سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ اس میں کیا مصلحت ہے۔ اس کے ساتھیوں نے شہر سے اس طرف آنے والے تمام راستوں پر نظر رکھی ہوئی تھی۔

سڑک دور دور تک سنسان پڑی تھی۔ وہ ابھی کوٹھی سے کچھ دور ہی تھا جب سکیم کے مطابق اس علاقے کی لائٹ آف کر دی گئی۔ اچانک بجلی فیل ہو جانے سے اندھیرا اتنا زیادہ بڑھ گیا تھا کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ سیٹھ کا چوکیدار بڑا ہوشیار تھا لیکن اسے علم نہ ہو سکا کہ علی نے کب کوٹھی کی دیوار پھاندی، پھر اندر داخل ہو گیا۔ وہ بلی کی طرح بغیر آواز پیدا کیے پنجوں کے بل چلتا ہوا سیٹھ کے گیراج تک آیا۔

چند منٹ کے بعد ہی وہ بغیر آواز پیدا کیے گاڑی کی ڈگی کھولنے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ گاڑی خاصی بڑی تھی اور علی جانتا تھا کہ وہ اس کی ڈگی میں خاصا وقت بڑے آرام سے گزار سکتا ہے۔ ڈگی میں بیٹھ کر اس نے ڈھکن بند کر دیا۔ اب اسے سیٹھ کا انتظار تھا تھوڑی دیر بعد ہی برقی رو بحال ہو گئی۔

☆☆☆☆☆

علی الصبح ہی سیٹھ کا چوکیدار اسے ہاتھ میں بریف کیس پکڑے اس طرف آتے دیکھ کر حیرا
ہوگیا۔ وہ سیدھا اپنی کار کی طرف آ رہا تھا۔ یہ خلاف معمول بات تھی۔ وہ اول تو اسوقت کہیں جا
ہی نہیں تھے۔ اگر جائیں بھی تو ڈرائیور ان کے ساتھ ہوتا تھا۔

سیٹھ کو کار کی طرف آتے دیکھ کر چوکیدار نے مودب ہو کر انہیں سلام کہا اور چاہا کہ ڈرائیو
بلا دے جس کی کوٹھڑی نزدیک ہی تھی۔ سیٹھ نے اس کا عندیہ بھانپ لیا تھا۔ انہوں نے چوکیدا
منع کر دیا۔ چوکیدار حیران ہی رہ گیا۔ سیٹھ گیراج کی طرف بڑھا۔ اس نے بریف کیس اپنے سا
ہی اگلی سیٹ پر رکھ لیا اور کار کو سٹارٹ کر کے باہر لے آیا۔

باہر سڑک پر ٹریفک نہ ہونے کے برابر تھا۔ پہلے کراسنگ پر پہنچ کر سیٹھ کو کار اچانک بریک
کر روکنا پڑی۔ ایک فقیر ان کی گاڑی کے نیچے آتے آتے بچا' لیکن سیٹھ نے دیکھ لیا تھا کہ اس
بڑی ہوشیاری سے ایک سادہ لفافہ سیٹھ کی کار کی کھلی کھڑکی سے اندر پھینک دیا۔ سیٹھ نے بڑ
حیرانگی سے لفافے کی طرف دیکھا۔ کراسنگ سے تھوڑی دور جا کر انہوں نے گاڑی سڑک
کنارے کھڑی کی اور لفافے کو چاک کیا۔ اندر سے تحریر برآمد ہوئی:

''گاڑی کو مال ایونیو کی طرف موڑ لو اور وہاں کار پارکنگ ایریا میں ہمارا انتظار کر
پروگرام تبدیل ہوگیا ہے۔''

سیٹھ نے ایک لمحے کیلئے کچھ سوچا پھر گاڑی کو دوسری سڑک کی طرف گھما دیا۔ اس نے
ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا کہ پولیس اس معاملے میں نہیں آئی۔ یہ لوگ تو اس کی توقع سے
زیادہ خطرناک اور ہوشیار ہیں۔

☆☆☆☆☆

مال ایونیو یہاں سے نزدیک ہی تھا۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہ پارکنگ ایریا میں پہنچ گئے۔ انہو
نے گاڑی ابھی ایک طرف کھڑی ہی کی تھی جب ایک شخص تیز قدموں سے چلتا اس طرف آیا
اگلا دروازہ کھول کر بیٹھ گیا۔ سیٹھ نے بریف کیس احتیاطاً اپنی داہنی طرف رکھ لیا تھا۔

''کہاں ہے رقم؟'' آنے والے نے پستول سیٹھ کی کمر سے لگاتے ہوئے پوچھا۔

''میرا بیٹا کہاں ہے؟'' سیٹھ نے بڑی جرات سے جواب دیا۔

اس نے سیٹھ سے کچھ فاصلے پر کھڑی ایک سیاہ رنگ کی کار کی طرف اشارہ کیا۔ سیٹھ نے
گردن گھما کر اس طرف دیکھا۔ کار کی پچھلی سیٹ پر دو آدمیوں کے درمیان ان کا بیٹا تنویر بیٹھا تھا۔
انہوں نے جان بوجھ کر اس طرف سے شیشہ نیچے گرایا ہوا تھا تاکہ سیٹھ کو منظر صاف دکھائی دے۔
سیٹھ کا دل دھک سے رہ گیا۔

اپنے بیٹے کو اس حال میں دیکھ کر ان کی حالت بگڑنے لگی لیکن انہوں نے جلد ہی خود پر قابو
پالیا۔ وہ بڑی دانش مندی سے کام لے رہے تھے۔

''ٹھیک ہے! تم میرے بیٹے کو یہاں لے آؤ۔ میرا بیٹا مجھے سونپ دو اور اپنی رقم وصول
کرلو۔'' انہوں نے اپنے ساتھ لگے بدمعاش سے بڑے مضبوط لہجے میں کہا۔

''دیکھو' تم اپنی زبان سے پھر رہے ہو۔ جب میں تمہارا مطالبہ پورا کر رہا ہوں تو تم بھی اپنا
وعدہ پورا کرو۔ جب تک میرا بچہ میرے حوالے نہ کیا گیا میں تمہیں ایک پھوٹی کوڑی نہیں دوں گا۔''
سیٹھ نے جرات سے کام لیا۔

''تمہارا بچہ تمہیں مل جائے گا سیٹھ! اپنا اور ہمارا وقت ضائع نہ کرو ورنہ اپنے ساتھ بچے سے
بھی ہاتھ دھو بیٹھو گے۔'' اس شخص نے دھمکی دی۔

''یہ نہیں ہوسکتا'' سیٹھ نے سختی سے اس کی بات رد کر دی۔

اس سے پہلے کہ اجنبی کوئی حرکت کرتا' کسی نے اچانک اس کی سمت والا کار کا دروازہ کھولا
اور اس کے بازو کو اپنی گرفت میں لے کر جھٹکے سے باہر کی طرف کھینچا۔ اچانک حملے نے اس
بدمعاش کو بوکھلا کر رکھ دیا۔ اس سے پہلے کہ وہ صورتحال کو سمجھے' جھٹکے سے وہ کار سے باہر آ رہا۔ اس
کے ساتھ ہی زوردار پستول کا دستہ اس کی کنپٹی پر لگا اور وہ بے ہوش ہوگیا۔

یہ ساری کارروائی کیپٹن علی کی تھی جو بغیر آواز پیدا کئے ڈگی سے باہر آ چکا تھا۔ سیٹھ رمضان
دل کے تو کمزور تھے لیکن بیٹے کی زندگی بچانے کیلئے وہ ہر خطرہ مول لینے کے لئے تیار ہوگئے۔
انہوں نے اپنی سمت کا دروازہ کھولا اور اس کار کی طرف دوڑے جسمیں ان کا بیٹا دو بدمعاشوں کی

گرفت میں موجود تھا۔ دوسری طرف گاڑی کے سواروں کو جیسے ہی کھیل کا پانسہ پلٹ جانے
احساس ہوا' ان میں سے ایک شخص فوراً دروازہ کھول کر باہر نکلا تا کہ اگلی سیٹ پر بیٹھ کر گاڑی کو بھ
لے جائے لیکن وہ یہ حسرت دل ہی میں لے کر رہ گیا۔

کیپٹن علی کے پستول سے نکلی گولی نے اس کی ٹانگ زخمی کر دی تھی۔ وہ لڑکھڑا کر وہیں ڈھیر
ہو گیا۔ اس سے پہلے کہ ان کا آخری ساتھی کوئی حرکت کرتا' کیپٹن علی موت کے فرشتے کی طرح
اس کے سر پر مسلط ہو گیا۔ اس نے اس بدمعاش کو بھی پستول نکالنے کی مہلت نہ دی اور اس کے
بازو کے جھٹکا دے کر کار سے باہر پھینک دیا۔ زمین پر گرتے ہی کیپٹن علی نے زوردار لات اس کے
جسم کے کسی ایسے حصے پر جمائی کہ اسے دوبارہ سر اٹھانے کی مہلت نہ مل سکی۔

تنویر اپنے والد کو دیکھ کر تیزی سے باہر کی طرف لپکا سیٹھ صاحب نے اسے اپنے سینے سے
چمٹا لیا۔ انکی آنکھیں خوشی اور احسان مندی کے ملے جلے آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں اور وہ بڑی
حیرانی سے اپنے اس اجنبی محسن کو دیکھ رہے تھے۔ اگر ان کا یہ پراسرار محسن بروقت کارروائی نہ کرتا
دولت کے ساتھ باپ بیٹا اپنی زندگی سے بھی ہاتھ دھو بیٹھتے۔

نزدیک ہی موجود پولیس کی ایک گشتی پارٹی فائرنگ کی آواز سن کر وہاں پہنچ گئی۔ کیپٹن علی
پہچانتے ہوئے پولیس انسپکٹر نے سلیوٹ مارا تو سیٹھ صاحب کو احساس ہوا کہ وہ کوئی اہم شخصیت
ہے۔ انہوں نے علی کا شکریہ ادا کیا۔ کیپٹن علی نے احتیاطاً دو کانسٹیبل ان کے ہمراہ کر دیئے اور سیٹھ
صاحب کو تنویر سمیت گھر روانہ کر دیا۔ اس کے خیال میں ابھی تنویر کی حالت ایسی نہیں تھی کہ وہ
پولیس کو بیان دے سکے۔

ملزموں کو پولیس کے حوالے کر کے وہ خود اپنے ہیڈ کوارٹر روانہ ہو گیا۔ زخمی ملزم کو پولیس
والے ہسپتال لے گئے۔ باقی دونوں کو حوالات میں بند کر دیا گیا۔ علی نے انکی خصوصی نگرانی کا حکم د
تھا۔

وہ اپنے آفس پہنچا تو ٹیپو کی رپورٹ وہاں موجود تھی۔ ٹیپو سڑک کی مسلسل نگرانی کر رہا تھا۔ علی
کی غیر موجودگی میں ٹیپو کی رپورٹ یہاں ریکارڈ ہو چکی تھی۔ اب وہ بڑی دلچسپی سے ٹیپو کی زبانی

پیٹرک کے معمولات سن رہا تھا۔

☆☆☆☆☆

دوپہر کھانے پر تینوں اکٹھے ہوئے تھے۔

عامر ساری رات اپنے ساتھیوں کے ساتھ شکرال کے پہاڑی علاقے میں مچھروں کی فوج
سے جنگ کرتا رہا تھا۔ اس کی تیاریاں دھری کی دھری رہ گئی تھیں۔ صبح اسے علی کا پیغام ملا کہ وہ لوگ
واپس لوٹ آئیں۔ اسے بڑی الجھن ہو رہی تھی۔

''اگر آپ نے خود ہی سب کچھ کرنا تھا تو ہمیں جھک مارنے کے لئے وہاں کیوں بٹھائے
رکھا۔ ساری رات مچھر ہمارا خون چوستے رہے ہیں۔'' وہ علی کو دیکھتے ہی پھٹ پڑا۔

''یار صبر کرو! کھانا کھالو۔ جوس پی لینا' خون پھر پیدا ہو جائے گا۔'' اس نے عامر کی طرف
دیکھتے ہوئے کہا۔

''کمال ہے! اتنا اہم معاملہ اور آپ.....''۔

''میں نے کہا ناں! خالی پیٹ زیادہ بولنا اچھا نہیں۔'' علی نے اس کی بات کاٹتے ہوئے
کہا۔

''میرا پیٹ خالی نہیں ہے جناب! میں ساری رات وہاں شکرال کی پہاڑیوں پر دھکے اور
گھاس کھاتا رہا ہوں اور مچھر میرا خون پیتے رہے ہیں۔ اب میرے پاس کھانے پینے کی گنجائش ہی
نہیں رہی۔ اب ذرا جلدی سے یہ معمہ حل کر دیجئے۔'' عامر نے جلے کٹے لہجے میں کہا۔

''اچھا بھائی! اگر تم جلد ہی جاننا چاہتے ہو تو سن لو۔ مجھے احساس تھا کہ ملزم اتنے بے وقوف
بھی نہیں جتنا ہم نے انہیں سمجھ لیا ہے لیکن یہ خیال تمہیں روانہ کرنے کے بعد آیا۔ میں نے سوچا'
اب تم اپنی منزل کھوٹی کیوں کرو۔ چلو' وہاں رات کو پکنک مناتے رہو۔ تم بھی کیا یاد کرو گے۔ اور تم
خود ہی تو کہا کرتے ہو کہ میں تمہیں تفریح کرنے کا بھی کوئی موقع نہیں دیتا۔ میں نے سوچا کہ ذرا تم
ہوا خوری بھی کر لو اور تفریح بھی رہے گی۔'' اس کے بعد علی نے اسے پیش آنے والے واقعات
سے آگاہ کر دیا۔

''پہلے ہی علم تھا کہ ایسا ہی ہوگا''۔ ٹیپو نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔

''تم تو چپ ہی رہا کرو''۔ عامر بولا۔

''ابھی صرف تین مجرم ہاتھ آئے ہیں۔ گروہ کے باقی لوگوں کو بھی پکڑنا ہے۔ اس بات کا بھی خیال رہے کہ باقی بچے ابھی ان کے قبضے میں ہیں۔ کہیں وہ خدانخواستہ بوکھلا کر ان کو نقصان نہ پہنچائیں۔ اب تو معاملہ اور بھی سنگین ہوگیا ہے۔'' علی نے انہیں بتایا۔

تینوں کھانا کھاتے ہی حوالات کی طرف چل دیئے جہاں علی دو ملزموں کو پولیس کی نگرانی میں چھوڑ آیا تھا۔ تیسرا زخمی ملزم ہسپتال میں تھا۔ پولیس کی نگرانی میں اس کا علاج ہو رہا تھا۔

خودکشی

تینوں حوالات پہنچے تو ایک چونکا دینے والی خبر انکی منتظر تھی۔ پولیس سٹیشن کے دروازے پر ہی ں نے انچارج کو پریشانی کی حالت میں ٹہلتے ہوئے پایا۔ اس نے گاڑی پر نظر پڑتے ہی علی کو وٹ مارا۔

''غضب ہوگیا جناب!'' علی کے باہر نکلتے ہی اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

''کیا؟'' کیپٹن علی کا ماتھا ٹھنکا۔

''جناب دونوں ملزموں نے شاید خودکشی کر لی ہے۔'' انچارج نے گھبراتے ہوئے کہا۔

''کیا کہہ رہے ہو تم! ہوش میں تو ہو'' علی نے اسے ڈانٹا۔

''جناب میں بالکل صحیح کہہ رہا ہوں۔'' انچارج بولا۔

علی سیدھا حوالات کی طرف گیا۔ عامر اور ٹیپو بھی اس کے تعاقب میں لپکے۔ واقعی دونوں م مردہ حالت میں پڑے تھے۔ ان کے جسم تھانے والوں نے چادروں سے ڈھانپ دیئے ئے۔

''انہوں نے خودکشی نہیں کی انہیں مارا گیا ہے'' علی نے حوالات کے دروازے کے قریب

رک کر انسپکٹر سے کہا۔

''جناب یہ کیسے ممکن ہے۔ تھانے میں کوئی ہماری آنکھوں کے سامنے یہ کیسے کر سکتا ہے'' انسپکٹر نے کہا۔

''ادھر آؤ!'' علی نے ایک سپاہی کو حوالات کا دروازہ کھولنے کی ہدایت کرتے ہوئے تینوں انسپکٹر کے ساتھ اندر داخل ہو گئے۔

انسپکٹر نے ان پر سے چادریں ہٹا دیں۔ علی جھک کر ان کے جسموں کا جائزہ لینے لگا۔ پھر نے انسپکٹر کو اپنے قریب بیٹھنے کی ہدایت کی۔

''یہ دیکھو!'' اس نے ایک ملزم کی گردن کے نزدیک لگی ایک سوئی کی طرف اشارہ کیا۔

انسپکٹر نے حیرانگی سے دیکھا۔ واقعی ایک معمولی سی لوہے کی سوئی اس ملزم کی گردن پیوست تھی۔ ''یہ سریع الاثر زہر میں بجھی ہوئی سوئی ہے۔'' اس نے انسپکٹر سے مخاطب ہو کر ''اس طرح افریقہ کے قبائل اپنے دشمنوں کی جان لیتے ہیں۔ یہ سوئی ایک نلکی کے ذریعے پھو مار کر پھینکی جاتی ہے۔'' علی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

انسپکٹر کی آنکھیں حیرت سے پھٹی جا رہی تھیں۔ اس کیلئے یہ واقعی چونکا دینے والا انکشا تھا۔ اس کی سروس کے دوران آج تک ایسا کوئی واقعہ پیش نہیں آیا تھا۔

''ان کی لاشیں پوسٹ مارٹم کیلئے بھیج دو'' اس نے انسپکٹر سے کہا۔

''آؤ چلیں۔'' علی نے تیزی سے باہر نکلتے ہوئے عامر اور ٹیپو کو مخاطب کیا۔ تینوں تیزی سے کار میں بیٹھے تھے۔ ڈرائیونگ سیٹ عامر نے سنبھال لی تھی۔ وہ کار کو برق رفتاری ہسپتال کی طرف لے جا رہا تھا۔

''مجھے امید تو نہیں کہ ان کا تیسرا ساتھی زندہ ملے گا لیکن پھر بھی.....'' علی نے کار میں ہی کہا تھا

ہسپتال پہنچنے پر اس کے اندیشے کی تصدیق ہو گئی کہ تیسرا ملزم بھی مارا جا چکا تھا۔ اس کی م بھی بالکل اسی طرح واقع ہوئی تھی۔ تینوں کو مارنے والے کا کوئی نام و نشان نہیں ملتا تھا۔

''میرا خیال ہے اب گھر ہی چلنا چاہئے۔'' عامر نے کوفتے ہوئے کہا۔

''کیوں؟'' ٹیپو نے دریافت کیا۔

''صبح سے تین مردے دیکھ چکے ہیں۔ اتنا کافی نہیں کیا؟''

''بے فکر رہو۔ یہ تمہیں خواب میں ڈرائیں گے نہیں'' علی مسکرایا۔

تینوں کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

ٹیپو کو تازہ ہدایات کے مطابق کیپٹن علی نے پیٹرک کی نگرانی کے لئے روانہ کر دیا۔ اب صرف وہی ایک ملزموں کا ایسا ساتھی بچا تھا جس کے ذریعے ان کے سرغنہ تک پہنچا جا سکتا تھا۔ شام تک تینوں کی پوسٹ مارٹم رپورٹ بھی مل گئی۔ رپورٹ کیپٹن علی کی توقعات کے عین مطابق تھی جس میں انکشاف ہوا تھا کہ تینوں کی ایک مہلک اور انتہائی تیز اثر زہر کے ذریعے موت واقع ہوئی ہے۔ اس قسم کے زہر اس براعظم میں نہیں پائے جاتے تھے۔

ملزموں نے شاید اس بات کا تہیہ کر رکھا تھا کہ وہ اپنا کوئی نام و نشان ایسا نہیں چھوڑیں گے جس کے ذریعے پولیس ان تک پہنچ سکے۔ کیپٹن علی جانتا تھا کہ تینوں ملزموں کو انکے سرغنہ نے اس لئے مروا دیا ہے تا کہ پولیس ان کے ذریعے تفتیش کر کے اس گروہ کے باس تک نہ پہنچ جائے۔

یہ ان لوگوں کی خوش قسمتی تھی کہ ابھی تک انہیں پیٹرک پر شک نہیں گزرا تھا کہ وہ پولیس کی نظروں میں آ چکا ہے ورنہ اس کا بھی اب تک پوسٹ مارٹم ہو چکا ہوتا۔

☆☆☆☆☆

شام ڈھل چکی تھی۔

ٹیپو اپنے گلے میں خوانچہ لٹکائے' پھیری لگانے والوں کا روپ دھارے پیٹرک کے گھر کی نگرانی کر رہا تھا۔ خوانچے میں اس نے بچوں کی ٹافیاں' گولیاں اور سگریٹ سجا رکھے تھے اور یہی تاثر دے رہا تھا جیسے وہ کوئی بہت غریب بچہ ہے اور خوانچہ لگا کر اپنے بوڑھے والدین کا پیٹ پال رہا ہے۔ اس کے ڈھیلے ڈھالے لباس میں ایک منا سا ٹرانسمیٹر بھی موجود تھا جس کے ذریعے وہ کیپٹن علی سے کسی بھی صورتحال میں رابطہ قائم کر سکتا تھا۔

ٹیپو نے اب تک پیٹرک کے مکان کے گرد دو تین چکر لگا لئے تھے۔ یہ خاصا غیر آباد سا علاقہ تھا۔ کالونی جدید طرز سے بنائی گئی تھی لیکن یہاں زیادہ تر سرکاری ملازمین ہی رہتے تھے۔ اکا دکا لوگ ہی کبھی کبھی آتے جاتے دکھائی دیتے تھے۔ زیادہ تر لوگ اپنے گھروں میں بند پڑے تھے۔

کالونی پر اب اندھیرا چھانے لگا تھا۔ مکانوں کے برآمدوں کے بلب روشن ہو رہے تھے جب ٹیپو نے ایک لمبی سی شیورلیٹ کار کو وہاں سے گزر کر کالونی کے سرے پر بنی گراؤنڈ کی جھاڑیوں کے نزدیک کھڑے ہوئے دیکھا۔ کار چلانے والے نے قدرے ویران جگہ پر کار کھڑی کی تھی۔ یہ علاقہ یوں بھی ایسا تھا کہ بہت کم لوگ گھروں سے باہر نکلتے تھے۔

بجلی کے پول اب روشن ہو گئے تھے۔ ٹیپو نے ایک لمبے تڑنگے آدمی کو کار سے نکل کر پیٹرک کے مکان کی طرف آتے دیکھا۔ اس کی چھٹی حس جس نے کبھی ٹیپو کو دھوکا نہیں دیا تھا' بیدار ہو چکی تھی۔ ٹیپو کو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس نے اس شخص کو ضرور پہلے کہیں دیکھا ہے۔

''کہاں؟'' یہ اسے یاد نہیں آ رہا تھا۔

اب تو آنے والے کے خدوخال واضح ہونے لگے تھے۔ جلد ہی اس کا چہرہ بلب کی روشنی میں ٹیپو کو دکھائی دیا۔ وہ چونک اٹھا:

''یہ تو وہی شخص تھا جس کی جیب سے اس نے بٹوہ اڑایا تھا۔''

''مجھے اس کے ٹھکانے کا پتہ لگانا چاہئے۔ ٹیپو نے سوچا۔

اس نے دیکھا' کار سے آنے والا پیٹرک کے مکان کی طرف جا رہا تھا۔ پھر اس نے پیٹرک کے مکان کی گھنٹی کے بٹن پر انگلی رکھ دی۔ ٹیپو کو فوراً ہی کوئی فیصلہ کرنا تھا۔ اس نے سوچا میرے لئے یہ تو ممکن نہیں کہ ان دونوں کی باتیں سن سکوں' کیوں نہ اس شخص کے ٹھکانے کا پتہ لگایا جائے۔ اس طرح کم از کم ملزموں کا ایک اور ساتھی تو بے نقاب ہو گا۔

یہی سوچ کر وہ اس کار کی طرف روانہ ہو گیا۔

☆☆☆☆☆

اپنا خوانچہ ٹیپو نے وہیں جھاڑیوں میں چھپا دیا اور کپڑوں سے ایک عجیب و غریب قسم کی چابی

نکالی۔

یہ چابی ایک لوہے کے تار کی بنی نظر آ رہی تھی۔ اس قسم کی چابیاں ہنگامی حالات میں لوگ کثرا اپنے پاس رکھا کرتے تھے۔ ٹیپو نے پہلے چاروں طرف نظریں دوڑا کر اطمینان کر لیا۔ دور دور تک کوئی ذی ہوش دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اس نے چابی کار کی ڈگی سے لگائی۔ اسے دو تین مرتبہ دھرا دھر گھمایا۔ ایک منٹ کے بعد ہی تالا ہلکی سی آواز پیدا کر کے کھل گیا۔

ٹیپو نے ڈگی کا ڈھکن اٹھایا اور اندر بیٹھ گیا۔ کار کی ڈگی اتنی کشادہ تھی کہ اس جیسے دو اور بچے بھی اطمینان سے اس کے اندر سما سکتے تھے۔ ڈھکن اس نے بند کر دیا اور دل ہی دل میں دعا کرنے لگا کہ اب اس کار کا مالک جلدی لوٹ آئے۔ اس کا جسم اب پسینے سے بھیگنے لگا تھا۔

تقریباً دس منٹ بعد خدا خدا کر کے اس نے کار کا انجن سٹارٹ ہونے کی آواز سنی۔ کار چلنے سے اس کے جسم کو کچھ ہوا لگی تو قدرے سکون محسوس ہوا۔ ٹیپو نے اندازہ لگایا کہ اس نے قریباً آدھ گھنٹہ تک کار میں سفر کیا تھا۔ اب تو اسے گھبراہٹ بھی ہونے لگی تھی۔ پھر جیسے قدرت کو اس کی حالت پر رحم آ گیا اور اس نے کار رکنے کی آواز سنی۔

انجن بند ہونے کے کم از کم دس منٹ بعد تک وہ اس حالت میں لیٹا رہا۔ پھر ہمت کر کے سیدھا ہوا۔ ڈگی کا ڈھکن اس نے تھوڑا سا کھول کر باہر کی صورتحال کا جائزہ لیا تو یہ دیکھ کر اس کا دل خوشی کے مارے بلیوں اچھل پڑا کہ کار کسی کھلی جگہ کی بجائے ایک گیراج میں کھڑی تھی۔ ٹیپو خدا کا شکر ادا کرتا باہر نکل آیا۔

باہر آ کر اس نے دیکھا کہ گیراج کا دروازہ بھی کھلا ہے۔ اس کوٹھی میں شاید کسی خصوصی پہرے کا انتظام نہیں تھا۔ ملزم بڑے ہوشیار تھے۔ وہ کوئی ایسی حرکت نہیں کر رہے تھے جو ان کو مشکوک ٹھہراتی۔

ٹیپو نے بڑی ہوشیاری سے گردوپیش کا جائزہ لیا اور کوٹھی کی چھوٹی سی دیوار پھلانگ کر باہر آ گیا۔ باہر آ کر اس نے کوٹھی کا نمبر پڑھا۔ یہ شہر کی ایک جدید کالونی تھی جو پیٹرک کے گھر سے کم از کم 20 کلومیٹر دور تھی۔

ٹیپو نے ایک محفوظ جگہ دیکھ کر اپنا ٹرانسمیٹر نکالا اور دوسرے ہی لمحے وہ کیپٹن علی سے مخاطب تھا:

''ہیلو انکل! اوور۔''

''ہیلو ٹیپو! اوور۔''

''انکل میں نے ان کے ایک اور ٹھکانے کا پتا لگایا ہے۔ اوور''۔ اس نے علی کو ساری کہانی دی۔

''شاباش بیٹے! تم نے بڑا کارنامہ سرانجام دیا ہے۔ وہیں ٹھہرو اور ان پر نظر رکھو۔ ہم ابھی رہے ہیں۔ اوور اینڈ آل۔'' سلسلہ منقطع ہو گیا۔

☆☆☆☆☆

ابھی بمشکل پانچ منٹ ہی گزرے تھے کہ ٹیپو نے دیکھا کہ چار جیپوں نے اس کوٹھی کو گھیرے میں لے لیا ہے۔ پھر اس نے ایک جیپ سے چھلانگ لگا کر عامر کو باہر آتے دیکھا۔

عامر اپنے دو ساتھیوں سمیت مین گیٹ سے اندر داخل ہوا تھا۔ ان کے باقی ساتھیوں جو مسلح تھے' کوٹھی کو چاروں طرف سے گھیرے میں لے لیا۔ عامر اور اس کے ساتھی سیدھے ڈرائنگ روم میں پہنچے جہاں تین آدمی بیٹھے تھے۔ عامر کی شکل پر نظر پڑتے ہی ان میں سے ایک نے جیب سے پستول نکال لیا۔ اس سے پہلے کہ وہ پستول کو سیدھا کرتا' عامر نے اپنی جگہ سے چھلانگ لگائی۔ اس کی ٹانگ چلی اور سیدھی اس شخص کے پستول والے ہاتھ پر لگی۔ پستول اس کے ہا سے نکل کر دور جا گری۔ زمین پر گرتے ہی عامر نے الٹی قلابازی لگائی اور دوسری زوردار لات ا کی کمر پر جما دی۔ وہ شخص اپنے ہی زور میں دیوار سے جا ٹکرایا۔ اس اثناء میں عامر کے ساتھیو نے بڑی پھرتی سے اس کے پستول پر قبضہ کر لیا تھا۔

''خبردار! کوئی اپنی جگہ سے نہ ہلے۔'' انہوں نے اپنے پستول نکال کر تینوں کو للکارا۔

ملزموں نے ہاتھ کھڑے کر دیئے۔

عامر کے ساتھیوں نے کوٹھی کے باقی کمروں کی بھی تیزی سے تلاشی لے لی لیکن یہاں

ں کے علاوہ اور کوئی نہ تھا۔

تھوڑی دیر بعد ہی وہ تینوں انٹیلی جنس کے ایک خفیہ ٹھکانے پر موجود تھے۔ اس مرتبہ علی کوئی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ عامر اس کی ہدایت پر ملزموں کو سیدھا وہیں لے آیا تھا۔

کیپٹن علی نے باری باری ان تینوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا۔ پھر اس کی یں ایک شخص کے چہرے پر جم گئیں۔ یہ شکل اسے کچھ جانی پہچانی دکھائی دے رہی تھی۔

علی نے اپنے ذہن پر زور ڈالا تو جیسے اسے ایک بھولی ہوئی کہانی یاد آ گئی۔

''اسے دوسرے کمرے میں لے آؤ۔'' اس نے اپنے ساتھیوں کو حکم دیا۔

تھوڑی دیر بعد وہ ملزم ایک کمرے میں کیپٹن علی کے ساتھ موجود تھا۔ یہاں وہ دونوں اکیلے ۔علی نے جان بوجھ کر ایسا ماحول بنا لیا تھا۔

''میں نے تمہیں پہچان لیا ہے''۔ اس کے منہ سے اچانک ہی نکلا۔ ملزم بوکھلا گیا۔

''ک' ک کیا مطلب!'' اس نے ہکلاتے ہوئے کہا۔

''مطلب بھی تم جلد سمجھ جاؤ گے وسیم!''

جیسے ہی علی کے منہ سے وسیم کا لفظ نکلا وہ شخص واقعی بوکھلا گیا۔

''مم..... میں کسی وسیم کو نہیں جانتا''۔

''میں نے کب کہا ہے کہ تم کسی وسیم کو نہیں جانتے۔ میں تو یہ کہہ رہا ہوں کہ تم خود وسیم ہو جو پڑھے لکھے گھرانے کا پڑھا لکھا لڑکا ہے جسے گندی صحبت نے برباد کر دیا۔ تم جانتے ہو رے فرار کے بعد تمہارے گھر والوں پر کیا گزری۔ تمہاری والدہ تمہارے غم میں رو رو کر اندھی لی ہے۔ تمہارے والد بھی چھٹی لے کر گھر بیٹھ گئے ہیں۔'' کیپٹن علی نے نفسیاتی حربہ آزمایا۔

اس نے دیکھا کہ وسیم کے چہرے کی رنگت بدلنے لگی ہے۔ وہ کسی گہری سوچ میں ڈوبا ئی دے رہا تھا۔

''وسیم! تم اب بھی چاہو تو قانون کی مدد کر کے اپنے لئے آسانی پیدا کر سکتے ہو۔ میں تم سے ہ کرتا ہوں کہ اگر تم اس گروہ کی گرفتاری میں مدد کرواؤ گے تو میں تمہارے لئے عدالت سے رحم

کی درخواست کروں گا۔ عین ممکن ہے کہ تمہیں سلطانی گواہ بنا کر تمہاری سزا معاف کر دی جائے تا کہ تم دوبارہ ایک شریف شہری بن کر زندگی بسر کر سکو۔ بولو تمہیں کیا منظور ہے؟''

علی کی بات ختم ہوتے ہی وسیم کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے۔ پھر اس نے رندھی ہوئی آواز میں کہا:

''کاش مجھے علم ہوتا کہ میں کتنے خطرناک گروہ میں پھنس چکا ہوں۔ میں تو سمجھا تھا کہ یہ لوگ صرف فراڈ ہی کرتے ہیں۔ لیکن یہ تو بڑے خطرناک لوگ ہیں۔ یہ تو بچوں کو اغواء کر کے دوسرے ممالک میں فروخت کر دیتے ہیں۔ میں نے کئی مرتبہ چاہا کہ ان کے چنگل سے نکل جاؤں لیکن ایک مرتبہ ان میں پھنسنے کے بعد یہاں سے نکلنا بہت مشکل ہے۔''

''تم بے فکر رہو۔ یہ میری ذمہ داری ہے۔ تمہارا کوئی بال بھی بیکا نہیں کر سکے گا۔'' کیپٹن علی نے اسے تسلی دی۔

اس نے وسیم کے لئے وہیں چائے منگوائی۔ اس کی حالت کو نارمل کرنے لگا۔ وسیم کے ذریعے اسے اس بات کا علم ہوا کہ یہ تو بہت بڑا گروہ ہے جس کا سرغنہ ایک شخص ہیبت خاں ہے۔ سرحدی پہاڑی علاقے میں رہتا ہے۔ ہیبت خاں ایک مضبوط قلعہ نما مکان میں رہتا ہے جس علاقے میں اس کا قیام تھا وہ چونکہ علاقہ غیر تھا اس لئے یہاں ہماری حکومت کوئی کارروائی بھی نہیں کر سکتی تھی۔

اس نے علی کو بتایا کہ ہیبت خاں امیر بچوں کو اغوا کرتا ہے۔ ان کے والدین کو بلیک میل کر کے ان سے پیسے چھیننے کے بعد بچے کو واپس نہیں کیا جاتا۔ اسے وہ لوگ اپنے علاقے میں ہی دیتے ہیں جہاں سے یا تو اسے آگے فروخت کر دیا جاتا ہے یا پھر اسے ساری زندگی کے لئے بھکاری بنا کر یہ لوگ اس سے بھیک منگواتے ہیں۔

وسیم نے بتایا کہ اغوا ہونے والے بچے بھی وہیں موجود ہیں۔

''جناب ہیبت خاں کے خلاف کارروائی کرنے سے پہلے وہاں کے دوسرے سرداروں کا اعتماد میں لینا پڑتا ہے لیکن یہ شخص اتنا طاقتور ہے کہ اس کے خلاف کوئی بھی حکومت کی مدد کے

ہیں ہوگا۔ بہر حال کچھ بھی ہو میں آپ کی ہر طرح سے مدد کرنے کے لئے تیار ہوں۔ میں آپ کو اپنی جان پر کھیل کر ہیبت خاں کے ٹھکانے پر لے جانے کے لئے تیار ہوں۔''

''تم مطمئن رہو۔ انشاء اللہ اب اسے دنیا کی کوئی طاقت قانون کی گرفت سے نہیں بچا سکتی'' علی نے اسے اطمینان دلایا۔

اس نے وسیم کو ایک ڈرامہ کرنے کی ہدایت کی اور اس کے چہرے اور جسم پر ایسے نشانات لگائے کہ اس کے دونوں ساتھی یہی سمجھیں کہ اس پر تشدد تو کافی ہوا ہے مگر اس نے کچھ بتایا نہیں۔ علی کے ساتھیوں نے جب وسیم کو دوبارہ دونوں ملزموں کے ساتھ بند کیا تو وہ اسے اس طرح دھکے دیتے ہوئے لے جا رہے تھے جیسے اس سے سخت ناراض ہوں۔ اسے خفیہ حوالات کے کمرے میں دیکھتے ہوئے علی نے بڑے طیش میں آنے کی اداکاری کرتے ہوئے کہا۔

''میں تمہاری بوٹیاں نوچ لوں گا۔ صبح تک سوچ لو۔ اگر تم نے صبح تک سب کچھ نہ بتایا تو تم تینوں کو گولی مار دی جائے گی۔''

''جو جی چاہے کر لو۔ میری زبان تم نہیں کھلوا سکتے۔'' وسیم نے بھی اسی طرح جواب دیا۔

علی بظاہر پیر پٹختا غصے میں بھرا وہاں سے واپس آ گیا۔

☆☆☆☆☆

سکیم کے مطابق دوسرے روز صبح کو پھر علی نے وسیم کو باہر نکالا۔ وہ لوگ وسیم کے ساتھیوں کو بھی تاثر دے رہے تھے کہ وہ اسے گولی مارنے کے لئے لے جا رہے ہیں۔ تھوڑی دیر بعد ہی وسیم نے خود کو ایک میک اپ روم میں پایا۔

کیپٹن علی نے آدھا گھنٹہ اس کے میک اپ پر لگایا۔ پھر اسے ایک جوڑا قبائلی قسم کا پہننے کو کہا۔ جب وسیم قبائلی لباس پہن کر آئینے کے سامنے آیا تو وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اس کی جگہ وہاں تو کوئی اور شخص ہی کھڑا تھا۔ وہ وسیم کے بجائے علاقہ غیر کا کوئی باشندہ دکھائی دے رہا تھا۔

''اف میرے خدایا! آپ تو جناب کمال کے آدمی ہیں۔'' اس کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔

''ابھی تم نے دیکھا ہی کیا ہے۔ یہ تو آدمی کو بندر بھی بنا سکتے ہیں۔'' عامر نے اندر داخل ہوتے ہوئے کہا۔

وسیم کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

''ہمیں تھوڑی دیر بعد یہاں سے روانہ ہونا ہے۔ تم لوگ تیاری مکمل کرلو۔'' اس نے عامر اور ٹیپو کو ہدایت دی۔

''مجھے تو معاف ہی رکھیں۔ ابھی میں نے زندگی میں دیکھا ہی کیا ہے۔'' عامر نے وہاں سے نکلتے ہوئے کہا۔

''اس مرتبہ تمہارا صحیح استعمال میں نے سوچ لیا ہے۔'' کیپٹن علی مسکرایا۔

''کیا استعمال؟'' ٹیپو نے لقمہ دیا۔

''میرے خیال سے ضرورت پڑنے پر عامر صاحب کو یرغمال چھوڑ کر اپنی جان بچالیں گے۔ وہاں کی روایت کے مطابق کسی لڑکی کو تو وہ لوگ یرغمال رکھتے ہی نہیں''۔

''مجھے آپ سے کوئی خوش فہمی بھی نہیں ہے۔'' عامر بولا۔

وسیم حیرانی سے انہیں دیکھ رہا تھا۔ اس طرح کے پولیس والے اس نے زندگی میں پہلی مرتبہ دیکھے تھے جو ہنستے مسکراتے ہوئے موت کے منہ میں چھلانگ لگانے جارہے تھے۔

مکڑوال

مکڑوال ایک وسیع پہاڑی سلسلہ تھا!

کہیں کہیں تو اس علاقے کی پہاڑی چوٹیاں آسمان سے باتیں کرتی دکھائی دیتی تھیں۔ اس وسیع پہاڑی سلسلے کے دوسری طرف ترنوال کا چھوٹا سا شہر آباد تھا۔ یہ ایک طرح کی تجارتی منڈی تھی لیکن دنیا بھر کا سمگل شدہ سامان یہاں فروخت ہوتا تھا۔ اس سرحدی منڈی پر تو حکومت کا کنٹرول تھا لیکن اس سے آگے علاقہ آزاد تھا۔

اس کے بعد حکومت کا کنٹرول ختم ہو جاتا تھا۔ اس سے آگے جانے والوں کے لئے واضح ہدایت موجود تھی کہ وہ اپنے رسک پر ہی آگے جاسکتے ہیں۔ ملک کے عام باشندے اس طرف سفر کرتے ہوئے ڈرتے تھے۔ کیا معلوم کب کوئی بھولی بھٹکی گولی کسی طرف سے آئے اور مسافر کی کھوپڑی میں سوراخ کرتی ہوئی نکل جائے۔ یہاں کے لوگ معمولی رقم لوٹنے کے لئے بھی دوسروں کی جان لینے سے نہیں چوکتے تھے۔

لوگوں کے اس طرف نہ جانے کی دوسری وجہ یہ بھی تھی کہ یہاں ہونے والی کسی بھی واردات کی حکومت کوئی ذمہ داری قبول نہیں کرتی تھی۔ یہاں داخل ہونے والا کوئی بھی شہری اپنے برے

بھلے کا خود ہی ذمہ دار تھا۔

ان حالات کے باوجود روزانہ سینکڑوں لوگ یہاں آتے جاتے رہتے تھے۔ان میں تعداد ان لوگوں کی ہوتی تھی جو مقامی لوگوں کے دوست تھے اور ان کی دعوت پر یہاں سیر و کے لئے آتے تھے۔ یہاں کے بڑے بڑے سردار اپنے مہمانوں کی دعوتیں کرنے میں شہرت رکھتے تھے۔اس کے علاوہ ان آنے والوں میں وہ لوگ بھی شامل ہوتے تھے جو اپنے میں اشتہاری مجرم تھے اور پولیس کی آنکھوں میں دھول جھونک کر جان بچا کر یہاں آ کر پنا لیتے تھے۔

ان اشتہاری مجرموں کی وجہ سے یہاں کے لوگوں کی آپس میں بھی دشمنیاں ہو جاتی کیونکہ جب حکومت کے ایجنٹ ان مفروروں کی گرفتاری کے لئے ادھر کا رخ کرتے تو ان دینے والوں اور حکومت کے وفاداروں کے درمیان لڑائی چھڑ جاتی اور پھر کئی روز تک پہاڑ فا کی آواز سے گونجتے رہتے۔

آج حسب معمول لوگوں کی آمد و رفت جاری تھی۔آنے والوں میں سیاحوں کی ایک بھی شامل تھی جس میں تین جوان آدمی اور ایک نوعمر لڑکا شامل تھے۔یہ لوگ یہاں کے ایک ملک گل کی دعوت پر آئے تھے۔

زرگل کیپٹن علی کا دوست تھا۔دونوں نے ایک یورپی ملک میں تین سال اکٹھے تعلیم حا تھی۔زرگل یہاں کے مقامی سردار کا بیٹا تھا۔دوران تعلیم اس کے والد کا انتقال ہو گیا تو اپنے کی رسم کے مطابق وہ قبیلے کے سردار کا عہدہ سنبھالنے کے لیے واپس لوٹ آیا۔

زرگل کے ساتھ علی کی دوستی کی وجہ ایک لڑائی بنی تھی یورپی ملک میں مقامی غنڈوں نے کو اکیلے دیکھ کر حملہ کر دیا۔اگر کیپٹن علی اس کی مدد کو نہ آتا تو عین ممکن تھا کہ زرگل اس روز جا سے ہاتھ دھو لیتا۔علی نے اپنی جان پر کھیل کر اور خود زخمی ہو کر اس کی جان بچائی۔

اس کے بعد سے تو دونوں اتنے گہرے دوست بنے کہ یہ دوستی آج تک قائم تھی۔ اکثر کیپٹن علی کے کام آتا رہتا تھا۔آج بھی اس روز جب علی نے اسے اطلاع دی کہ وہ اس

علاقے کی سیر کرنے آ رہا ہے تو زرگل کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا۔وہ اپنے دوست کا استقبال کرنے کے لئے مکڑوال کی سرحد تک آیا تھا۔

اس بات کا تو اسے بھی بخوبی علم تھا کہ علی کی آمد کسی مقصد کے بغیر نہیں ہو سکتی۔ضرور وہ اس طرف کسی مہم کو سر کرنے نکلا ہے۔کچھ بھی تھا وہ اپنے دوست کی آمد پر خوشی سے پھولے نہیں سما رہا تھا۔

مکڑوال کی سرحد سے زرگل اور اس کے ساتھی علی اور اس کے ساتھیوں کو اپنے ساتھ جیپوں میں سوار کر کے لائے تھے۔انہوں نے ملاقات پر روایتی انداز میں فائرنگ کر کے اپنی خوشی کا اظہار کیا تھا۔

شام ڈھلے وہ سب زرگل کے ڈیرے پر پہنچ گئے۔ یہاں ان کے لیے شان دار ضیافت کا بندوبست کیا گیا تھا۔رات گئے تک وہ لوگ ضیافت اڑاتے رہے۔پھر علی اپنے دوست زرگل کے ساتھ ایک علیحدہ کمرے میں چلا آیا۔اس کے باقی ساتھی تو کبھی کے لمبی تان کر سو گئے تھے لیکن یہ لوگ یہاں صلاح مشورے میں مصروف تھے۔

علی نے اپنے دوست کو ساری بات بتا دی اور یہ بھی بتا دیا کہ وہ لوگ یہاں کس ارادے سے آئے ہیں۔اپنی گفتگو کے خاتمے پر اس نے پوچھا:

''یہ ہیبت خاں آخر ہے کیا بلا؟''

''وہ کوئی بھی ہو تمہیں اس کی فکر نہیں کرنی چاہیے۔ میں اس سلسلے میں تمہاری ہر طرح مدد کروں گا کیونکہ یہ میرا اخلاقی اور مذہبی فرض بھی ہے کہ میں اس ظالم کی قید سے معصوم بچوں کو آزاد کروانے میں تمہاری مدد کروں۔'' زرگل نے اپنی عظیم روایات کے مطابق جواب دیا۔

''دوست تمہارا شکریہ!'' علی نے کہا۔

دونوں دوست آئندہ کی صورت حال کے لیے لائحہ عمل طے کرنے لگے۔علی نے اسے سمجھا دیا تھا کہ وہ کس منصوبے پر عمل کرنے جا رہا ہے اور اسے کس مرحلے پر زرگل کی مدد درکار ہو گی۔

☆☆☆☆☆

مکڑوال کے پہاڑی سلسلے کے آخری کونے پر ہیبت خاں ایک قلعہ نما مکان میں رہتا تھا نزدیک ہی پہاڑیوں کے درمیان اس نے اغوا شدہ بچوں کا ایک بیگار کیمپ بنا رکھا تھا جہاں ملک سے اغوا کر کے بچوں کو لایا جاتا تھا۔ یہ بہت ظالم شخص تھا۔ معصوم بچوں کو طرح طرح کی اذیتیں کرتا۔ ان پر اتنی وحشت طاری کر دی جاتی تھی کہ وہ یہاں سے بھاگنے کا تصور بھی نہ کر سکتے تھے۔

یہاں آنے کے بعد ہیبت خاں ہر اغوا شدہ بچے کے جسم پر اپنی مہر لگایا کرتا تھا۔ اس طریقہ بڑا ہی وحشیانہ تھا۔ وہ لوگ اغوا شدہ بچوں کے ہاتھوں اور پاؤں میں بیڑیاں ڈال کر انہیں ایک میدان میں لے آتے جہاں ایک دائرے کی شکل میں ہیبت خاں اور اس کے ساتھی جشن رہے ہوتے تھے۔ جلتی ہوئی آگ میں لوہے کے ایک سلاخ تپائی جاتی اور ایک ایک بچے کی کمر باری باری نشان لگا دیا جاتا۔ جب درد سے تڑپتا ہوا بچہ تکلیف کی اذیت سے چلاتا تو یہ لوگ زور زور سے قہقہے لگاتے۔ یہ بڑا تکلیف دہ عمل تھا۔ ان بچوں کے ساتھ وہ لوگ ہر طرح کا ظلم روا رکھتے کوئی ان کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتا تھا۔

☆☆☆☆☆

ہیبت خاں کا ترنوال کے علاقے میں منشیات کا کاروبار بھی تھا۔ وہ یہاں عام طور پر آیا کرتا تھا۔ اس روز اور کیپٹن علی اور وسیم بھی یہاں اپنے بھیس بدلائے گھوم رہے تھے۔ کیپٹن علی کی شکل دیکھنا چاہتا تھا۔ وسیم نے اسے ہیبت خاں کی شکل دکھا دی۔

علی اس کی دیدہ دلیری پر حیران رہ گیا۔ حالانکہ یہ علاقہ حکومت کے کنٹرول میں تھا، لیکن شخص کھلے عام اپنے گھناؤنے جرم میں مصروف تھا۔

اس نے ہیبت خاں کو دیکھ کر دل ہی دل میں ایک منصوبہ بنا لیا۔ اور وسیم کے ساتھ مکڑ واپس لوٹ آیا۔ اس دوران اس نے ترنوالی میں ہیبت خاں کے ٹھکانے دیکھ لیے تھے لیکن مرحلے پر وہ اس کے کسی ساتھی کو گرفتار کر کے کیس بگاڑنا نہیں چاہتا تھا۔

''ہیبت خاں! تم خدا کے انتقام کی زد میں آنے والے ہو۔'' اس نے دل ہی دل میں کہا

شام کو وہ لوگ اپنے ڈیرے پر پہنچ گئے۔ اس دوران علی نے وسیم کو ایک منصوبہ سمجھا د

س پر اسے عمل کرنا تھا۔

''کہاں تشریف لے گئے تھے جناب؟'' عامر نے انہیں دیکھ کر پوچھا۔

''ہم ذرا ترنوال تک سیر کرنے گئے تھے''

''یہ سیر و سیاحت کیا ہماری قسمت میں نہیں لکھی جو آپ ہر جگہ ایسے ہی تشریف لے جاتے یں؟''

''میں نے تمہارے لیے بھی سیر کا پروگرام بنا لیا ہے۔''

علی نے وسیم کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔

''خدا خیر کرے! آثار اچھے نظر نہیں آتے۔'' عامر بولا۔

''تمہیں ہیبت خاں کے کیمپ کی سیر کو بھیجا جا رہا ہے۔ امید ہے کہ تم اس کا مہمان بننا ضرور پسند کرو گے۔ کیا خیال ہے؟''

''اس سے تو بہتر تھا آپ مجھے جہنم کی سیر پر روانہ کر دیتے۔ کم از کم ہیبت خاں کے کیمپ سے تو وہ جگہ بہتر تھی۔'' عامر نے جلے کٹے لہجے میں کہا۔

''وہاں سے اگر واپس لوٹ آئے تو جہنم کی سیر کو بھی ضرور جانا۔ میرے خیال سے وہاں بھی تمہاری ضرورت ہے۔''

''جی ہاں! وہ تو ہے ہی۔ میرے بغیر وہاں کے لوگ کا دل بھی کیسے بہلے گا۔'' عامر نے اسی لہجے میں جواب دیا۔

''اچھا، زیادہ باتیں نہ بناؤ اور میرے ساتھ آؤ۔''

وہ وسیم اور عامر کو اپنے ساتھ ایک کونے میں لے گیا اور دونوں کو منصوبہ سمجھانے لگا جس پر انہوں نے عمل کرنا تھا۔

اگلے روز پلان کے عین مطابق ملک کے تمام اخبارات میں وسیم کی تصویر بھی شائع کی گئی اور یہ لکھا گیا کہ وسیم ایک خطرناک مجرم ہے جو پولیس کی حراست سے نکل کر فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا ہے۔ اسے گرفتار کروانے والے کے لئے ایک بڑی رقم کا اعلان کیا گیا تھا۔

اس خبر کے تین روز بعد ہیبت خاں کے گھر کے باہر اسکے پہرے داروں نے دو آدمیوں
شام ڈھلے اس طرف آتے دیکھا۔ وہ اجنبیوں کو اس طرف آتے دیکھ کر انہوں نے اپنی رائفلیں
تان لیں۔

''خبردار! وہیں رک جاؤ۔ کون ہو تم لوگ؟'' ان میں سے ایک نے کڑک کر پوچھا۔

''ہم دوست ہیں اور ہیبت خاں سے ملنے آئے ہیں۔'' ان میں سے ایک نے کہا۔

''کہاں سے آئے ہو؟'' پہرے دار نے پوچھا۔

''جاؤ خان کو اطلاع دو۔ ہمارا اور اپنا وقت ضائع نہ کرو۔ اگر اسے علم ہو گیا کہ تم نے ہمیں
روکا ہے تو وہ تمہیں گولی مار دے گا۔'' آنے والوں میں سے دوسرے نے اس طرح کہا کہ پہرے
دار سہم کر رہ گیا۔ اس نے اپنے ایک ساتھی سے کہا کہ فوراً جا کر خان کو اطلاع دو۔

تھوڑی دیر بعد دونوں نے ہیبت خاں کو اس طرف آتے دیکھا۔

''ارے وسیم تم!'' ہیبت نے اسے دیکھ کر قہقہہ لگایا۔

''شاباش! میں نے تمہارے فرار کی خبر اخبار میں پڑھ لی تھی۔

شاباش! تم واقعی ایک بہادر انسان ہو''

وسیم کے دوسرے ساتھی عامر نے دیکھا کر وسیم نے آگے بڑھ کر اچانک اس کے پاؤں
پکڑ لیے۔ وہ اس کی شان دار اداکاری پر اسے دل ہی دل میں داد دینے لگا۔ حالانکہ وہ خود
زبردست اداکار تھا لیکن وسیم کی ایکٹنگ بھی لاجواب تھی۔

''سردار! میں بڑی مصیبت سے فرار ہوا ہوں۔ ان لوگوں نے مجھ پر بہت ظلم کیا لیکن
میرے منہ سے ایک لفظ نہ نکلوا سکے۔''

''شاباش! ہم اس کا انعام دیں گے وسیم!'' ہیبت خاں نے زوردار قہقہہ لگایا۔

اچانک وہ سنجیدہ ہو گیا۔

''یہ کون ہے۔'' اس نے عامر کی طرف اشارہ کیا۔

''سردار! یہ بڑے کام کی چیز ہے۔ اس کی مدد سے میں فرار ہوا ہوں۔ یہ ہرفن مولا ہے۔ ا

مضحکہ خیز شکل پر نہ جانا۔ بڑا کائیاں اور بہادر انسان ہے۔ سردار! یہ میرا پرانا واقف تھا لیکن بہت
صے بعد اس سے دوبارہ حوالات ہی میں ملاقات ہوئی ہے۔ اس کے جسم کو نہ دیکھو۔ یہ فولاد کا بنا
ا انسان ہے۔''

''ارے یہ تو کاغذ کا بنا دکھائی دے رہا ہے۔'' ہیبت خاں نے عامر کی طرف دیکھ کر قہقہہ
ایا۔

''دیکھو سردار! میں غصے کا بڑا سخت آدمی ہوں۔ زیادہ دانت نکالنے کی ضرورت نہیں۔ جس کو
بڑا پھنے خاں سمجھتے ہو اس سے میرا مقابلہ کروا کر دیکھ لو۔ تمہیں خود ہی علم ہو جائے گا کون کتنے پانی
ں ہے۔'' عامر نے غصے سے کہا۔

اس کی بات مکمل ہونے کی دیر تھی کہ ہیبت خاں کے چہرے کی رنگت یک دم بدل گئی۔ اس
ی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ یوں لگتا تھا جیسے اس کے بجائے وہاں کوئی خونخوار بھیڑیا کھڑا ہو۔
یم دل ہی دل میں اس صورت حال پر گھبرا اٹھا۔ اس نے سوچا کہ کیس خراب ہو گیا۔ اب ہماری
یر نہیں۔

''تم میرے کسی آدمی سے مقابلہ کرو گے؟'' ہیبت خاں کی خوں خوار آواز سنائی دی۔

''ہاں کروں گا!'' عامر نے اس طرح جواب دیا جیسے کان سے مکھی اڑا رہا ہو۔

''ٹھیک ہے۔ مجھے بھی ایسے تماشے دیکھنے کا شوق ہے۔ ایک بات یاد رکھنا، اگر تم ہار گئے تو
میں تمہیں موقع پر گولی مار دوں گا۔ اگر جیت گئے تو تمہاری قسمت جگا دوں گا۔ میں بہادر
انسانوں کی قدر کرتا ہوں''۔

''ٹھیک ہے! ٹھیک ہے!'' عامر نے لاپرواہی سے کہا۔ ''جیسے مرضی بلا لو۔''

''نہیں، اس وقت نہیں۔ سردار ہیبت خاں کے بھی کچھ اصول ہیں۔ تم لوگ لمبا سفر کر کے
آئے ہو۔ آرام کرو۔ کل صبح دیکھیں گے۔''

اس کے بعد اس نے اپنے ایک ساتھی کو مقامی زبان میں کچھ کہا اور وہاں سے چلا گیا۔ یہ
شخص دونوں کو اپنے ساتھ لے کر ایک کمرے میں چلا آیا۔ عامر یہ دیکھ کر حیران ہی رہ گیا کہ اس

غیر آباد اور پسماندہ علاقے میں یہ جدید ترین ساز و سامان سے لیس کمرہ کہاں سے آ گیا! ا
یوں لگتا تھا جیسے وہ کسی فلم کا منظر دیکھ رہا ہو۔

تھوڑی دیر بعد ایک ملازم انکے لیے پر تکلف کھانا رکھ کر چلا گیا۔

''جناب! یہ آپ نے کیا کر دیا۔ اس طرح تو بنا بنایا کھیل بگڑ جائے گا۔'' تنہائی ملتے ہی نے عامر سے کہا۔

''تم چپ رہو یار! بڑے دیکھے ہیں میں نے ایسے ویسے سردار''۔ عامر نے اس کا مذ اڑاتے ہوئے کہا۔

''جناب مصلحت کا بھی کوئی تقاضا ہوتا ہے۔ آپ کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا'' وسیم بڑے ادب سے کہا۔

''چپ چاپ سو جاؤ یار! کیوں میرے کان کھا رہے ہو۔ تم میرے افسر بن کر نہیں آئے۔'' عامر نے کہا۔

کھانا ختم ہو چکا تھا۔ وہ دونوں اپنے لیے پہلے سے موجود چارپائیوں پر لیٹ گئے۔ وہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ عامر کو ذرا برابر بھی صورت حال کی سنگینی کی فکر نہیں ہے۔ وہ تھوڑی دیر بعد گھوڑے بیچ کر سو گیا۔ جب کہ فکر کے مارے وسیم ساری رات کروٹیں بدلتا رہا۔ اسے رہ رہ کر ا ہی فکر کھائے جا رہی تھی کہ عامر سردار کے آدمیوں کا مقابلہ کیسے کرے گا۔

صبح انہوں نے ناشتہ کیا تو ہیبت خاں نے دونوں کو باہر بلوا لیا۔ باہر ایک چھوٹے سے میا میں اس کے باقی غنڈے دائرے کی شکل میں بیٹھے تھے۔

''ان میں سے کسی ایک کو بھی مقابلے کے لیے چن لو'' اس نے عامر کو مخاطب کیا۔

''یہ تمہاری مرضی ہے سردار! جو تمہارا سب سے بہادر آدمی ہے اسے میرے مقابلے پ دو''۔ عامر نے لاپرواہی سے کہا۔

ہیبت خاں نے ایک لمحے کے لیے سوچا، پھر اپنے ایک ساتھی سے جوان میں سب زیادہ ہٹا کٹا اور جس کا قد چھ فٹ سے بھی زیادہ تھا، مخاطب کرتے ہوئے کہا:

''گل خاں! ذرا اس چڑے کو آٹے دال کا بھاؤ سمجھانا۔''

''یہ بے چارہ میرا مقابلہ کیا کرے گا'' عامر نے اس کے قد کاٹھ کا جائزہ لے کر زبردستی مسکراتے ہوئے کہا۔ حالانکہ اب اسے اندازہ ہونے لگا تھا کہ خوامخواہ ایک مصیبت گلے ڈال لی۔

گل خاں ہیبت خاں کا نائب اور اس علاقے کا مانا ہوا غنڈہ بھی تھا۔ عام حالات میں وہ ایک انسان سے زیادہ جن دکھائی دیتا تھا، کیونکہ اس کا رنگ بھی عام لوگوں کے برعکس کالا تھا۔

''میں اور اس کیکڑے سے مقابلہ کروں!'' اس نے عامر کو دیکھ کر قہقہہ لگایا۔ قہقہہ لگانے میں باقی غنڈوں نے بھی اس کا پورا ساتھ دیا۔

''ابے تارکول کے ڈرم! ابھی تیری ساری ہوا نکل جائے گی۔'' عامر نے کچھ اس طرح ہاتھ ہلا کر کہا کہ وہاں موجود سب ہی لوگ کھلکھلا کر ہنس پڑے۔

گل خاں کی آنکھوں میں تو جیسے خون اتر آیا۔ اس نے اپنی رائفل ایک طرف پھینک دی اور عامر کی طرف دونوں ہاتھ پھیلائے اس طرح بڑھا جیسے اس کا گلا گھونٹ کر اسے مار ہی ڈالے گا۔

عامر نے اپنے چہرے پر ایسے تاثرات طاری کر رکھے تھے جیسے اس سے خوف زدہ ہو گیا ہو۔ گل خاں اپنے زور میں آگے بڑھ رہا تھا۔ عامر نے اچانک جھکائی دی اور وہ منہ کے بل زمین پر آ رہا۔ اس کے زمین پر گرتے ہی اس کے ساتھیوں نے پھر قہقہہ لگایا۔ قہقہے کی آواز نے گل خان کی حالت زخم کھائے بھیڑیے جیسی کر دی تھی۔ وہ دوبارہ اٹھا اور غصے سے کھولتے ہوئے عامر کی طرف بڑھا۔ اس مرتبہ عامر نے کوشش کی تھی کہ اس کی ٹانگوں کے درمیان سے نکل جائے، لیکن اس کا ایک ہاتھ کسی طرح گل خاں کے قبضے میں گیا۔ اس نے چاہا کہ بل دے کر عامر کا بازو توڑ ڈالے لیکن ہیبت خاں اور اس کے ساتھیوں نے بڑی حیرانگی سے دیکھا کہ عامر نے اپنے پاؤں زمین پر لٹکاتے ہوئے قلابازی لگائی اور خود کو گل خاں کی گرفت سے آزاد کرا لیا۔

اس کے ساتھ ہی اس نے دوبارہ فضا میں جست لگائی اور گل خاں کی گردن پر سوار ہو گیا۔ گل خاں کسی سانڈ کی طرح پھنکار رہا تھا۔ عامر نے اپنی دونوں ٹانگیں اس کی پسلیوں پر جمائیں اور

دونوں ہاتھ جوڑ کر زوردار دوھتو اس کے سر پر جمایا۔ اس کے ساتھ ہی وہ جست لگا کر زمین پر آ رہا۔ جانے اس نے گل خاں کے سر پر کہاں ضرب لگائی تھی کہ اسے چکر آ گیا۔

زمین پر تو عامر کے پاؤں گویا لگتے ہی نہیں تھے۔ اس نے سیدھے ہوتے ہوئے اچھل کر فلائنگ کک گل خاں کے سینے پر جمائی اور وہ کٹے ہوئے شہتیر کی طرح زمین پر گر پڑا۔

عامر اس کے جسم پر بڑے مضحکہ خیز انداز میں سرکس کے جوکروں کی طرح ناچنے لگا۔ ایک دو مرتبہ گل خاں کے جسم نے جنبش کی پھر وہ بے ہوش ہو گیا۔

''شاباش وسیم! تم نے واقعی ہمیں کمال کے آدمی سے ملایا ہے''۔

اس کے بعد وہ عامر کی طرف بڑھا۔

''جوان! آج سے تم ہمارے نائب ہو۔'' اس نے عامر کا ہاتھ اٹھا کر اعلان کیا۔

ہیبت خاں کے اس اعلان سے بہت سے لوگوں کے چہرے تن گئے۔ بعض نے خوشی کا بھی اظہار کیا اور یہی بات عامر چاہتا تھا۔

☆☆☆☆☆

روانگی پر عامر نے اپنا ننھا سا ٹرانسمیٹر اس اڈے کے نزدیک ہی ایک پہاڑی میں چھپا دیا تھا۔ اب وہ ہیبت خاں کا نائب تھا اور کسی کی جرات نہ تھی کہ اس کی کسی بات پر شک کرتا۔ وہ ٹہلتا ہوا پہاڑی کے قریب گیا اور ایک قدرے محفوظ آڑ میں بیٹھ کر کیپٹن علی سے سلسلہ ملانے لگا۔

علی، زرگل اور ٹیپو بے چینی سے اس کے پیغام کے منتظر تھے۔ جیسے ہی عامر لائن پر آیا، کیپٹن علی نے اپنا ٹرانسمیٹر لگا لیا۔

عامر نے خوب مرچ مصالحہ لگا کر اسے اپنے کارنامے کی خبر کر دی تھی۔

''واہ میرے شیر! کبھی کبھی تو تم کمال ہی کر دیتے ہو۔'' علی نے اسے داد دیتے ہوئے کہا۔

''جی ہاں! عام حالت میں تو میں بالکل گدھا ہی رہتا ہوں ناں۔'' عامر کے لہجے کی شوخی ان حالات میں بھی برقرار تھی۔

''اس کا فیصلہ بھی ہوتا رہے گا۔ فی الحال کل تک کے لیے خدا حافظ!''

عامر ہیلو ہیلو ہی کرتا رہ گیا۔ سلسلہ منقطع ہو چکا تھا۔

اب کیپٹن علی نے زرگل کے ساتھیوں کی مدد سے رات کے اندھیرے میں ہیبت خاں کے اس قلعہ نما مکان کے نزدیک واقع ایک پہاڑی کی چوٹی پر ایک کیمپ لگا لیا تھا۔ اس کیمپ سے وہ لوگ دوربین کے ذریعے حالات کا چوری چھپے جائزہ لیتے رہتے تھے۔

ہیبت خاں نے اغوا شدہ بچوں کا کیمپ اپنے مکان کے اندر ہی بنا رکھا تھا۔ یہاں سے کسی کے فرار ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ زرگل نے علی کو تجویز پیش کی تھی کہ رات کے اندھیرے میں وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ اس مکان پر حملہ کر کے بچوں کو آزاد کرا لے لیکن کیپٹن علی نے یہ تجویز رد کر دی۔ اس طرح کسی بچے کی موت کا خطرہ بھی ہو سکتا تھا اور وہ کسی معصوم بچے کی جان کا خطرہ مول لینا نہیں چاہتے تھے۔

وہ کوئی ایسا منصوبہ تیار کرنا چاہتا تھا جس کی مدد سے پہلے بچوں کو محفوظ کر لیا جاتا، اس کے بعد ہی وہ لوگ حملہ کرتے۔ پھر اس نے ایک تجویز تیار کر لی اور خدا سے اس کی کامیابی کی دعا کرنے لگا۔

کیپٹن علی عامر سے خود رابطہ قائم نہیں کرتا تھا۔ اس طرح عامر کے گرفتار ہونے کا خطرہ درپیش تھا۔ اس نے عامر کو ہدایت کر رکھی تھی کہ وہ خود ہی دن میں کم از کم ایک مرتبہ اس سے رابطہ قائم کر کے اسے حالات سے باخبر رکھا کرے۔

اس روز جب عامر نے موقع پا کر کیپٹن علی سے رابطہ قائم کیا تو اس نے عامر کو نئے منصوبہ کی اطلاع دے دی جو اس نے تیار کیا تھا۔ اس منصوبے میں ٹیپو نے ایک اہم رول ادا کرنا تھا۔

ہیبت خاں کی طرح کچھ اور غنڈے بھی یہاں بچوں کے اغوا کے کاروبار میں ملوث تھے۔ اس روز صبح صبح وسیم ایک بچے کو پکڑ کر لے آیا جس کے جسم پر پھٹے پرانے کپڑے تھے اور صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ فرار ہو کر آیا ہے۔ اس نے بچے کو اپنے قائم مقام سردار عامر کے سامنے پیش کیا۔

''سردار! یہ بچہ ہادی گل کے کیمپ سے بھاگ کر آیا ہے اور علاقہ سے نکل رہا تھا کہ میں نے اسے پکڑ لیا''۔

شاباش! یہ تو ہمارے لیے تحفہ ہو گیا، مفت کا تحفہ۔" اس دوران بچے نے رونا شروع کر دیا۔

"خبردار اگر آواز نکالی ورنہ اٹھا کر آگ میں پھینک دوں گا۔" عامر نے کڑک کر کہا تو بچہ سہم کر خاموش ہو گیا۔

"لے جاؤ اسے اور بند کر دو۔" عامر نے غنڈوں کی طرح زوردار قہقہہ لگایا۔ اس کے ساتھی بھی اس کے ساتھ ہی قہقہے لگانے لگے۔

وسیم کو یہ حکم دیتے ہوئے اس نے مخصوص اشارہ بھی کر دیا۔ یہ لڑکا بھلا ٹیپو کے سوا اور کون ہو سکتا تھا۔ اس طرح ٹیپو اغوا شدہ بچوں کے درمیان بڑے اطمینان سے پہنچ چکا تھا۔

☆☆☆☆☆

جب سے گل خاں نے عامر کے ہاتھوں زک اٹھائی تھی وہ انتقام کی آگ میں جل رہا تھا۔ وہ ہر وقت کسی موقع کی تلاش میں رہتا تھا کہ عامر کو نیچا دکھا سکے۔

لیکن عامر اس کی توقع سے بہت زیادہ ہوشیار اور چالاک ثابت ہوا تھا۔ گل خاں اس کے لیے اگر کوئی جال بچھاتا تو وہ بڑی آسانی سے نکل جاتا۔

گل خاں اپنے ساتھیوں کے معاملے میں بھی بڑا ظالم واقع ہوا تھا۔ معمولی سی بات پر اپنے ساتھی کو گولی مار دینا اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ اس لئے اس کے ساتھی بھی اس کے خلاف ہو رہے تھے۔ انہوں نے عامر کے نائب سردار منتخب ہونے پر بڑی خوشی کا اظہار کیا تھا۔

اب یہ گروہ دو حصوں میں بٹ چکا تھا۔ ایک حصہ گل خاں کا حمایتی تھا اور دوسرا نئے سردار کا۔

آج عامر کے ہاتھ ایسا موقع آ گیا تھا جس کا وہ بڑی بے چینی سے منتظر تھا۔ ان کے سردار ہیبت خاں نے اطلاع دی تھی کہ کل بچوں کا ایک ٹرک بھر کر ترنوال سے جانا ہے جہاں انہیں غیر ملکی برده فروشوں کے ہاتھ فروخت کیا جائے گا۔

"میرا خیال ہے حالات کے پیش نظر اس مرتبہ ٹرک کے ساتھ گل خاں کو بھیجا جائے۔" وسیم نے صلاح پیش کی۔

"تمہارا کیا خیال ہے نائب سردار؟" ہیبت خاں نے عامر سے پوچھا۔

"وسیم ٹھیک کہتا ہے سردار! واقعی گل خاں جیسے پرانے آدمی کو ہی اس مہم پر بھیجا جائے۔ وہ بہت بہادر آدمی ہے۔ میری نظر میں تو اس کے علاوہ اور کوئی ایسا شخص نہیں جس پر اعتبار کیا جا سکے کیونکہ ہم لوگ پہلے ہی پولیس کی نظروں میں آ چکے ہیں۔"

"تمہارا کیا خیال ہے گل خاں؟" سردار ہیبت خاں نے براہ راست اسے مخاطب کیا۔

"سردار کے حکم پر بھلا اسے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔" گل خاں کے بجائے عامر نے جواب دیا۔

"تم چپ کیوں ہو گل خاں؟ بولتے کیوں نہیں؟" ہیبت خاں نے اس کی طرف دیکھ کر دوبارہ کہا۔

"غالباً گل خاں اب بوڑھا ہو رہا ہے اور ذمہ داریوں سے گھبرانے لگا ہے۔" عامر نے دوبارہ لقمہ دیا۔

"زیادہ باتیں نہ کیا کرو، سردار کا احترام ہے ورنہ اب تک تمہیں....." گل خاں نے دانت پیستے ہوئے عامر کو مخاطب کیا۔

"گل خاں! میرے بھی کچھ اصول ہیں جن کی خلاف ورزی میں برداشت نہیں کر سکتا۔ اس بات کا خیال رہے کہ یہ تمہارا نائب سردار ہے"۔ ہیبت خاں نے اسے غصے سے گھورتے ہوئے کہا۔

"میں معافی چاہتا ہوں سردار!" گل خاں گڑبڑا گیا۔

"ٹھیک ہے، تم کل دس بجے ٹرک لے کر روانہ ہو جاؤ۔" ہیبت خاں نے اپنا فیصلہ سنایا۔

☆☆☆☆☆

ترنوال کی طرف جانے والے راستے میں ایک جگہ کیپٹن علی اور اس کے ساتھیوں نے ناکہ بندی کر رکھی تھی۔ زرگل اس کے ساتھ ہی بیٹھا تھا۔ جب اچانک علی کے ہاتھ میں پکڑے ٹرانسمیٹر میں زندگی کی لہر پیدا ہونے لگی۔

ٹرانسمیٹر پر عامر نے انہیں خبر دی کہ ٹرک روانہ ہو چکا ہے۔ علی نے مزید کوئی بات کہے سنے

بغیر ٹرانسمیٹر آف کر دیا۔

اگلی رات زبردست آندھی چلی تھی اور سڑک کے کنارے لگے کئی درخت ٹوٹ کر گر
تھے۔ اس وقت زرگل اور اس کے ساتھیوں نے علی کی ہدایت پر سڑک کے درمیان ایک درخ
بالکل ایسے پھینک دیا تھا جیسے وہ آندھی سے گر کر ٹوٹا ہو۔

جلد ہی انہیں ایک دور کی پہاڑی پر ٹارچ جلتی بجھتی نظر آئی۔ یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ ٹر
نزدیک آ رہا ہے۔ گہرا اندھیرا دور دور تک پھیلا ہوا تھا۔ یہاں تو شام ڈھلنے کے بعد ہی لوگ ا
گھروں میں قلعہ بند ہو کر بیٹھ جاتے تھے۔ اس وقت تک کسی کے جاگتے رہنے کا سوال ہی پیدا نہ
ہوتا تھا۔

اب انہیں ٹرک کی ہیڈ لائٹس بھی نظر آنے لگی تھیں۔ سب لوگ چوکنے ہو کر بیٹھ گئے۔ ع
نے بتایا کہ اگلی سیٹ پر ڈرائیور کے ساتھ گل خاں موجود ہوگا اور ٹرک کے پچھلے حصے میں بچوں
نگرانی کے لئے دو مسلح غنڈے اور موجود ہیں۔ انہیں ان چاروں کو بغیر کسی ہنگامے کے قابو کرنا ہ

سڑک کے درمیان کٹا ہوا درخت دیکھ کر ڈرائیور نے بریک لگائے اور ٹرک روک لیا۔
لوگ چوکنے ہو کر بیٹھ گئے۔ آج تک کسی نے ہیبت خاں کے ٹرک کو روکنے کی کوشش یا جرات نہ
کی تھی۔ یہ ان کے لئے انہونی بات تھی۔ دو تین منٹ تک وہ لوگ ٹرک میں بیٹھے رہے۔

''رات کی آندھی کی وجہ سے درخت گر گیا ہوگا۔ یار تم بھی خواہ مخواہ گھبرا جاتے ہو''۔ گل خ
نے بالآخر ڈرائیور سے کہا۔

''آؤ نیچے اتر کر دیکھتے ہیں''۔ یہ کہہ کر وہ ہاتھ میں پستول تھامے نیچے اتر آیا۔

جیسے ہی اس کے پاؤں زمین سے لگے۔ اندھیرے میں ایک جھاڑی میں چھپے کیپٹن علی
ہاتھ بڑھا کر اس کی ٹانگ کھینچ لی۔ زمین پر گرتے ہی اس کی کنپٹی پر علی نے اپنے پستول کا
آزمایا۔ ایک ہی ضرب اتنی زوردار تھی کہ گل خاں نے دوبارہ سر نہ اٹھایا۔

دوسری طرف سے اترنے والے ڈرائیور کے ساتھ بھی یہی سلوک زرگل نے کیا تھا۔
نے ڈرائیور پر پشت سے حملہ کیا اور رائفل کے زوردار بٹ سے اسے زمین چاٹنے پر مجبور کر دیا

علی نے بڑی پھرتی سے مدہوش گل خاں کو دھکا دے کر ٹرک کے نیچے کر دیا۔ دوسری طرف
یہی عمل زرگل نے دہرایا۔ اب دونوں زمین پر لوٹنیاں کھاتے ٹرک کے پچھلے ٹائر کے نزدیک پہنچ
گئے۔

پچھلے حصے میں دونوں بدمعاش بچوں کے سروں پر رائفلیں تانے کھڑے تھے۔ جب تین
چار منٹ تک ادھر سے کوئی حرکت نہ ہوئی تو ان میں سے ایک رائفل تانے چھلانگ لگا کر نیچے اتر
آیا۔ اس نے زمین پر قدم دھرے ہی تھے کہ علی نے اس کی پنڈلی پر پستول کا دستہ آزمایا اور وہ منہ
کے بل نیچے آ گرا۔ اس کے ساتھ ہی اس کے سر کے پچھلے حصے پر قیامت ٹوٹ گئی۔ اس کے زمین
پر منہ کے بل گرنے سے جو آواز پیدا ہوئی تھی اس نے اندر موجود بدمعاش کو صورتحال کی سنگینی کا
احساس دلایا۔ اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اور ٹرک سے چھلانگ لگا کر ایک طرف کو دوڑ لگا دی۔ اس
صورتحال کا سامنا کرنے کے لئے کیپٹن علی پہلے ہی تیار تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ فائرنگ کی آواز
سے لوگ ہوشیار ہو جائیں کیونکہ انہوں نے یہ سارا عمل بڑی رازداری سے طے کرنا تھا۔

علی کے پستول پر پہلے ہی سے سائلنسر فٹ تھا۔ اس نے بھاگتے بدمعاش کی ٹانگ کو نشانہ
بنایا اور پہلا ہی فائر اس کی پنڈلی میں لگا۔ وہ منہ کے بل زمین پر آ رہا۔

زرگل کے دو آدمیوں نے بھاگ کر اسے قابو کر لیا۔ اب صورتحال یہ تھی کہ چاروں بدمعاش
رسیوں میں جکڑے ٹرک کے پچھلے حصے میں بچوں کے ساتھ ہی موجود تھے اور زرگل کا ایک آدمی
ان کے ساتھ ہی بیٹھا تھا جبکہ زرگل نے ڈرائیور کی سیٹ سنبھال لی۔ اس کا ایک اور ساتھی اپنی
گود میں سٹین گن لئے اس کے ساتھ ہی بیٹھا تھا۔ ٹرک بڑی تیز رفتاری سے ترنوال کی طرف جا رہا
تھا جہاں ایس پی صاحب پولیس کے ساتھ ان کے استقبال کے لئے موجود تھے۔

انہوں نے ٹرک ترنوال سے باہر ہی روک لیا۔ پولیس کی جمعیت نے ٹرک کو گھیرے میں
لے لیا۔ بچوں کو فوج کے ہیلی کاپٹروں کے ذریعے وہاں سے اگلی منزل پر پہنچا دیا گیا اور بدمعاشوں
کو پولیس والے ٹرک سمیت اپنے ساتھ لے گئے۔

علی نے اس بات کا خاص اہتمام کیا تھا کہ رازداری برقرار رہے۔ اس کی ہدایت پر پولیس

نے یہ اپریشن بالکل خفیہ رکھا تھا۔ جب تک علی حکم نہ دیتا' برآمد شدہ بچوں کو ان کے والدین سے بھی نہیں ملایا جا سکتا تھا۔ علی ہیبت خاں کے قلعے میں موجود بچوں کی رہائی سے پہلے کوئی خطرہ مول لینا نہیں چاہتا تھا۔

پولیس افسروں نے اس اپریشن میں مدد کرنے پر سردار زرگل کا خاص طور سے شکریہ ادا کیا تھا۔

☆☆☆☆☆

دوسری طرف جب اگلے روز تک کوئی اطلاع گل خاں کی واپسی کی نہ ملی تو ہیبت خاں غصے سے کھولنے لگا:

''مجھے سمجھ نہیں آتی کہ ہمارے ساتھ کس نے دشمنی لینے کی جرات کی ہے''۔ اس نے اپنے نائب سردار کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''سردار! میرے دماغ میں ایک بات آ رہی ہے''۔ عامر نے منصوبے پر عمل شروع کرتے ہوئے کہا۔

''کیا نادر خان؟'' عامر نے یہاں اپنا نام نادر خاں بتایا ہوا تھا۔

''کسی میں اتنی ہمت نہیں کہ وہ ہیبت خاں سے دشمنی مول لے سکے۔ میرے خیال میں ہم اپنوں کی سازش کا شکار ہو گئے ہیں۔''

''کیا مطلب ہے تمہارا؟ میں ذرا موٹے دماغ کا آدمی ہوں۔ کھل کر بات کرو''۔ ہیبت خاں کے چہرے پر الجھن کے آثار صاف دکھائی دے رہے تھے۔

''دیکھو سردار! میرے آدمیوں نے سارا علاقہ چھان مارا ہے۔ راستے میں کسی ہنگامے کی کوئی اطلاع نہیں ملی۔ تم جانتے ہو ان پہاڑوں میں چلنے والی ایک بھی گولی کی آواز میلوں دور تک سنائی دیتی ہے۔ کہیں ایک فائر بھی نہیں ہوا۔ سردار! اصل یہ گل خاں کی سازش ہے۔ اس نے مجھ سے انتقام لیا ہے اور ہم سب کو مروانے کا بندوبست کر گیا ہے۔'' عامر نے اطمینان سے اسے بے وقوف بنانا شروع کر دیا۔

''وہ کیسے؟'' ہیبت خاں نے بے قراری سے پوچھا۔

''سردار! دراصل جب سے میں تمہارا نائب بنا ہوں' وہ اور اس کے کچھ ساتھی میرے خلاف ہو گئے ہیں۔ انہیں اس بات پر غصہ بھی ہے کہ مجھے تمہاری حمایت حاصل ہے۔ اس روز بھی تم نے گل خاں کو میری حمایت میں ڈانٹ دیا تھا۔ اس نے بچے کسی اور پارٹی کے ہاں فروخت کر دیئے ہیں اور اب اپنے ساتھیوں سمیت ٹرک لے کر غائب ہو گیا ہے۔'' عامر نے آخری تیر بھی چلا دیا اور اس کا یہ تیر بھی نشانے پر لگا۔

''واقعی یار تم بہت عقلمند انسان ہو لیکن میں اسے چھوڑوں گا نہیں''۔ ہیبت خاں بولا۔

''سردار! تم بے فکر ہو جاؤ۔ اگر وہ دارالحکومت کی طرف ہی گیا ہے تو میں اسے اس کی سات تہوں سے بھی نکال کر تمہارے سامنے پیش کر دوں گا۔ مجھے تو اس کے ساتھیوں کی فکر ہے۔ فی الحال ہمیں ان سے نمٹنا ہے۔'' عامر نے اسے نئی لائن دی۔

''ارے یہ کون سی مشکل بات ہے۔ انہیں بلاؤ اور ایک ایک کر کے گولی مار دو''۔ ہیبت خاں نے غصے سے کھولتے ہوئے کہا۔

''نہیں سردار! جلد بازی اچھی نہیں۔ ہمیں جذبات کے بجائے عقل سے کام لینا ہے۔ تم اطمینان رکھو۔ پہلے انہیں غیر مسلح کرنا ضروری ہے۔ اگر وہ لوگ مقابلے پر آئے تو خواہ مخواہ ہمارے ایک آدھ ساتھی کو جان سے ہاتھ دھونے پڑیں گے۔''

''تم کہتے تو ٹھیک ہو لیکن.....''۔

''لیکن ویکن چھوڑو سردار! بس ذرا مجھ کو ان سے نمٹ لینے دو۔ پھر بس دیکھو تمہارے گل خاں کو لے کر کیسے آتا ہوں۔''

''شاباش! تم واقعی میرے صحیح جانشین ہو''۔

☆☆☆☆☆

ٹیپو کو پہلے پہل تو بڑی مشکل پیش آئی۔ وہ جس کسی سے فرار کی بات کرتا وہی بچہ خوف کے مارے منہ دوسری طرف کر لیتا۔ وہ اتنے خوفزدہ تھے کہ یہاں سے کبھی فرار کا تصور بھی ذہن میں

نہیں لا سکتے تھے۔

خدا خدا کر کے اس روز اس نے اپنے ساتھ دو اور بچوں کو تیار کیا۔ اس روز انہیں بند کر
کی ذمہ داری وسیم کی تھی۔ رات کو ان بچوں کو ایک ہی زنجیر ان کے ایک ایک پاؤں میں ڈال
باندھ دیا جاتا تھا۔

اس روز رات کے وقت جب بچوں کو باندھنے کی باری آئی تو ٹیپو جان بوجھ کر اس سر
چلا گیا جس پر تالا لگایا جانا تھا۔ وسیم نے بڑی ہوشیاری سے تالے کی چابی اسے تھما دی۔

ان سے کچھ فاصلے پر ایک مسلح پہرے دار موجود تھا۔ تھوڑی دیر بعد ہی وسیم نے ٹیپو کو مخص
اشارہ کیا اور وہاں سے چل دیا۔ اس اشارے کا مطلب یہ تھا کہ اگلے منصوبہ پر عمل شروع کر دو۔

ٹیپو نے جب دیکھا کہ پہرے دار نے انکی طرف پیٹھ کر رکھی ہے تو اس نے بڑے آرام
اپنا تالا کھولا اور پاؤں آزاد کرا لیا۔ اس کے دونوں ساتھی اس کے ساتھ ہی بندھے تھے۔ ا
نے بھی ڈرتے ڈرتے بغیر آواز پیدا کئے۔ زنجیر ڈھیلی کی اور خود کو آزاد کر دالیا۔

ٹیپو نے اب اپنی جگہ سے پہرے دار کی طرف کھسکنا شروع کر دیا تھا۔ باقی بچے دم بخو
کی طرف دیکھ رہے تھے۔ اگر پہرے دار اس طرف دیکھ لیتا تو ٹیپو کو فوراً گولی مار دیتا۔ لیکن جو
اللہ کے بھروسے پر کوئی بھی نیک کام کرتے ہیں' اللہ تعالیٰ ان کی مدد بھی ضرور کرتے ہیں۔

پہرے دار منہ دوسری طرف کئے سگریٹ سلگانے لگا اور اس نے اپنی رائفل کرسی کے
لگا رکھی تھی۔ اس کے تو وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں آ سکتی تھی کہ کبھی کوئی یہاں سے بھا
تصور بھی کرے گا۔ آج تک کسی بچے نے اس کیمپ سے فرار ہونے کی جرات نہیں کی تھی۔

ٹیپو جیسے جیسے اس کی طرف بڑھ رہا تھا اس کے ساتھیوں کو اپنا دم گھٹتا محسوس ہو رہا تھا
انہوں نے ایک عجیب و غریب منظر دیکھا۔ ٹیپو نے اچانک لپک کر رائفل اٹھائی۔ عین ان
میں پہرے دار نے اس طرف منہ کر لیا۔

وہ تو ٹیپو کے ہاتھ میں رائفل دیکھ کر ہکا بکا ہی رہ گیا۔ حیرت سے اس کا منہ کھلا ہی تھا جہ
نے رائفل گھما کر اس کا بٹ پوری قوت سے پہرے دار کے منہ پر مارا۔ وہ الٹ کر پرے جا

اس سے پہلے کہ وہ سنبھل سکے ٹیپو نے دوبارہ رائفل گھمائی اور اس مرتبہ اس کے سر کو نشانہ بنایا۔ اب
اس میں اٹھنے کی سکت ہی باقی نہیں رہ گئی تھی۔

''شاباش! ہمت کرو' نکلو۔'' اس نے اپنے ساتھیوں کو جوش دلایا۔

ٹیپو کے اس کارنامے نے ان پر بڑی جرات پیدا کر دی تھی۔ اس نے اپنے دونوں ساتھیوں
کی مدد سے بچوں کو محض ایک منٹ میں آزاد کرا لیا اور پہلے سے طے شدہ منصوبے کے مطابق وہ
لوگ دو گروپوں میں بٹ کر دیواروں سے چپک کر کھڑے ہو گئے۔

☆☆☆☆☆

عین انہی لمحات میں باہر فائرنگ شروع ہو گئی۔

یہ کارنامہ وسیم کا تھا جس نے گل خاں کے ساتھیوں کو ہیبت خاں اور اس کے نائب کے
خلاف بھڑکایا تھا اور اطلاع دی تھی کہ اب وہ لوگ ان کو غیر مسلح کر کے جان سے مارنے کا
بندوبست کرنے والے ہیں۔ یہ سنتے ہی گل خاں کے ساتھیوں نے طیش میں آ کر ہیبت خاں پر
فائرنگ شروع کر دی تھی۔

وسیم اسی دوران بھاگ کر ٹیپو کے پاس آ گیا تھا۔ پھر وہ سب وسیم کی زیر نگرانی اس افراتفری
کا فائدہ اٹھا کر قلعے سے باہر نکل آئے۔

اندھیرا اتنا تھا کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ دوسری طرف ہیبت خاں اور اس کے
ساتھی گل خاں کے ساتھیوں کا مقابلہ کرتے ہوئے آپس میں کٹ مر رہے تھے۔ وسیم انہیں ایک
انتہائی محفوظ راستے سے قریباً ڈیڑھ دو فرلانگ تک دور لے آیا جہاں زرگل کے ساتھی ایک ٹرک پر
ان کے منتظر تھے۔

بچوں کو ٹرک میں سوار کرا دیا گیا۔ جو برق رفتاری سے ترنوال کی طرف روانہ ہو گیا' جہاں
سے راتوں رات بچوں کو پولیس کے محفوظ ہاتھوں میں منتقل کر کے زرگل کے ساتھی اپنے ڈیرے پر
واپس پہنچ گئے۔

ایک نئی خبر

مقابلہ زوروں پر تھا۔ ہیبت خاں اور اس کا نائب نادر خاں ایک مضبوط مورچے میں بیٹھے فائرنگ کر رہے تھے۔ جب وسیم کو انہوں نے بھاگتے ہوئے اس طرف آتے دیکھا۔

''سردار! ہمارے آدھے سے زیادہ آدمی مارے جا چکے ہیں۔ جتنی جلدی ممکن ہو نکل چلو۔ ان لوگوں نے اپنی مدد کے لئے دوسرے قبیلے کے لوگوں کو بھی بلا لیا ہے''۔ وسیم نے ہانپتے ہوئے منصوبے کے مطابق بتایا۔

''ارے ان کی ایسی تیسی''۔ ہیبت خاں نے اپنی رائفل اٹھا کر باہر نکلنا چاہا۔

''سردار! بے وقوف مت بنو''۔ اچانک اس کے نائب نے ہیبت خاں کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ''ابھی ان لوگوں کا پلہ بھاری ہے۔ فی الحال یہاں سے نکل جانے ہی میں مصلحت ہے۔ ہم تازہ کمک لے کر صبح تک واپس آ جائیں گے۔ اگر دوسرے قبیلے کے لوگ ان کی مدد کو پہنچ گئے تو ہم سب کتے کی موت مارے جائیں گے۔''

''کہتے تو تم ٹھیک ہی ہو''۔ ہیبت خاں بولا۔ ''آؤ اپنی منزل کھوٹی نہ کرو۔''

عامر نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچا اور وہ تینوں ایک دوسرے خفیہ راستے سے باہر

آ گئے۔ یہاں ایک جیپ ان کی منتظر تھی۔

''یہ کیا!'' ہیبت خاں نے حیرانگی سے پوچھا۔

''میں آپ کا نائب ہوں سردار! اور آپ کی جان کی حفاظت میری ذمہ داری ہے۔ میں برے حالات کا بندوبست پہلے ہی کر لیا کرتا ہوں۔ یہ جیپ میں نے اسی لئے ہر وقت تیار رکھی تھی کہ اگر خدانخواستہ ایسا کوئی موقع آ جائے تو ہم اپنی جان بچا سکیں۔''

''شاباش! تم واقعی لاجواب آدمی ہو۔''

''شکریہ سردار!'' عامر نے ڈرائیور کی سیٹ سنبھال لی۔

سردار اس کے ساتھ ہی اگلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ جیپ کے پچھلے حصے میں وسیم بیٹھ گیا جہاں ترپال کا ڈھیر سا پڑا نظر آ رہا تھا اور عامر نے ہیبت خاں کو بتایا تھا کہ ترپال کے نیچے اس نے ضروری اسلحہ رکھا ہوا ہے جو صبح کی لڑائی میں ان کے کام آئے گا۔''

جیپ کو وہ بڑی تیز رفتاری سے بھگاتا چلا جا رہا تھا۔

''تم تو ڈرائیور بھی کمال کے ہو۔'' ہیبت خاں نے اسے بے ساختہ داد دی۔

''ابھی آپ نے میرا کمال دیکھا ہی نہیں سردار! ابھی تو آپ کو میں نے کچھ دکھایا ہی نہیں''۔ عامر نے دل ہی دل میں مسکراتے ہوئے کہا۔

''لیکن یہ تو ترنوال کا راستہ ہے۔ ہم جا کدھر رہے ہیں؟'' ہیبت خاں نے اچانک اس سے پوچھا۔

''میں بتاتا ہوں تمہیں کہ تم کدھر جا رہے ہو''۔ پچھلی سیٹ سے جواب آیا۔

''یہ کیپٹن علی کی آواز تھی جو ترپال کے نیچے چھپ کر بیٹھا تھا۔ اس نے پستول پچھلی سیٹ میں سے ہیبت خاں کی گردن سے لگا دیا۔

''یہ کون ہے؟ یہ کیا تماشہ ہے؟'' ہیبت خاں غصے سے چلایا۔

''سردار کیوں اپنا گلہ خراب کرتے ہو۔ میں اس کے خلاف کچھ نہیں کر سکتا۔ یہ تو میرا بھی استاد ہے۔'' عامر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"تمہاری ایسی تیسی!" ہیبت خاں نے کوئی حرکت کرنا چاہی کہ اچانک کیپٹن علی نے اپنے پستول کے دستے کی زوردار ضرب اس کی کنپٹی پر لگائی اور وہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔

"کیا مطلب! یعنی میری آنکھوں کے سامنے میرے سردار کی توہین!" عامر نے گردن موڑ کر علی کی طرف دیکھا۔

"چلتے رہو ورنہ سردار کے سامنے تم بھی....." علی نے قہقہہ لگایا اور تینوں ہنس دیئے۔

ترنوال تک کیپٹن علی اسے داد دیتا آیا تھا۔ اس نے عامر کو بتایا تھا کہ ٹیپو بھی اپنے ساتھی بچوں کے ساتھ بحفاظت دارالحکومت پہنچ چکا ہے۔

ترنوال کی سرحد پر آئی جی آفریدی صاحب ان کے منتظر تھے۔ انہوں نے یہ عظیم کارنامہ سرانجام دینے پر کیپٹن علی اور اس کے ساتھیوں کو داد دی کیونکہ اخبارات نے بچوں کے اغواء کی وارداتوں پر پولیس کی خوب خوب خبر لی تھی۔

اگلے روز کیپٹن علی نے زرگل کا شکریہ ادا کیا اور وہ لوگ واپس ترنوال آ گئے جہاں سے ایک ہیلی کاپٹر ان کو دارالحکومت لے آیا۔

☆☆☆☆☆

انسپکٹر ناصر بڑی مستعدی سے انکی غیر حاضری میں پیٹرک کے گھر کی نگرانی کر رہا تھا۔ ایک روز اسے علی کی طرف سے اطلاع ملی کہ پیٹرک کے گھر پر چھاپہ مار کر اسے گرفتار کر لیا جائے۔ جب انسپکٹر ناصر اپنی ٹیم کے ساتھ پیٹرک کے گھر میں داخل ہوا تو وہ کہیں جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ اس کے بریف کیس پر انسپکٹر ناصر نے قبضہ کر لیا اور وہ لوگ پیٹرک کو گرفتار کر کے ہیڈ کوارٹر لے آئے۔ اس کے گھر کی تلاشی لی گئی تو وہاں سے زرد رنگ کا ایک عجیب و غریب قسم کا کیمیکل پاؤڈر برآمد جسے تجزیہ کے لئے انسپکٹر ناصر نے پولیس لیبارٹری میں بھیج دیا۔

اس وقت کیپٹن علی، ناصر اور ٹیپو اپنے ہیڈ کوارٹر میں موجود تھے اور انسپکٹر ناصر کیپٹن علی کو رپورٹ پیش کر رہا تھا کہ اچانک ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔

علی نے فون اٹھایا۔ دوسری طرف سے اس کے محکمے کے ڈائریکٹر کرنل شیرازی اس

طب تھے۔ انہوں نے علی کو آفس بلایا تھا۔ آئی جی مسٹر آفریدی بھی کرنل شیرازی کے پاس ہی ے تھے۔ جب علی اپنے آفس میں پہنچا تو کرنل شیرازی کے سامنے ایک رپورٹ ٹائپ کی ہوئی ی تھی۔ انہوں نے وہ رپورٹ اٹھا کر علی کو پڑھنے کے لئے دے دی اور ساتھ ہی کہا:

"ہماری لیبارٹری میں تو اس پاؤڈر کا تجزیہ ممکن ہی نہ تھا۔ ہم نے ملک کے عظیم سائنسدان ڈاکٹر عجمی سے اس کا تجزیہ کروایا ہے اور انہوں نے یہ رپورٹ دی ہے۔ اسے غور سے پڑھ لو۔"

علی نے رپورٹ پڑھنی شروع کی۔ وہاں لکھا تھا:۔

"یہ کیمیکل پاؤڈر انتہائی خطرناک ہے اور ایٹمی اسلحہ کے لئے بھی استعمال ہو سکتا ہے۔ اس سے تیار ہونے والا گولہ بارود انتہائی تباہ کن ثابت ہو سکتا ہے۔"

"آفریدی صاحب تو رپورٹ دیکھ کر چکرا گئے ہیں۔" کرنل شیرازی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"جناب! بات ہی ایسی ہے!" آفریدی صاحب نے تشویش ظاہر کی۔

"سر! آپ بے فکر رہیں۔ خدا نے چاہا تو انشاء اللہ ہم اس سازش کو بھی ناکام بنا دیں گے۔" کیپٹن علی نے بڑے مضبوط لہجے میں کہا۔

"ہمیں تمہاری ٹیم پر فخر ہے بیٹے! اور تم سے بہت سی امیدیں وابستہ ہیں"۔ کرنل شیرازی بولے۔

"میں نے ایک گزارش کی تھی سر کہ وسیم نے ہماری بہت مدد کی تھی اور وہ خاص ہمدردی کا مستحق ہے"۔ علی نے کہا۔

"گھبراؤ نہیں! وہ وعدہ معاف گواہ بن چکا ہے۔ میں نے اس کی رہائی کی سفارش بھی کر دی ہے۔" آئی جی نے اسے اطمینان دلایا۔

پھر سب لوگ نئی سازش کا مقابلہ کرنے کیلئے منصوبہ بندی کرنے لگے۔

پیٹرک بڑا سخت جان ثابت ہوا۔ کیا مجال جو کسی بھی قسم کے تشدد یا سختی کے سامنے اس نے ہتھیار ڈال کر زبان کھولی ہو۔ بڑے بڑے ماہر تفتیش اس کے سامنے بے بس نظر آ رہے تھے۔

پولیس نے اس پراسرار کیمیکل پاؤڈر کا راز اگلوانے کیلئے ایڑی چوٹی کا زور لگا لیا تھا لیکن پیٹرک ڈ
سے مس سے نہیں ہوا تھا۔

''مجھے سمجھ نہیں آتی کہ آخر یہ شخص کس چیز سے بنا ہوا ہے'' آئی جی آفریدی صاحب نے
اس وقت کیپٹن علی کے پاس بیٹھے پیٹرک کے متعلق بتا رہے تھے' بالآخر کہا۔

''آپ نے اس کی تفتیش کی ذمے داری کس کے سپرد کی ہے؟'' کیپٹن علی نے کچھ سو
ہوئے ان سے دریافت کیا۔

سراغ رسانی اور تفتیش کا جو خصوصی سیل قائم کیا گیا ہے' میں نے خاص طور سے یہ ذمے دا
ان لوگوں کو سونپی تھی۔ لیکن یہ شخص تو کسی طرح کی مار پیٹ یا تشدد کا اثر ہی قبول کرنے کیلئے تیار نہ
ہوتا۔ خدا جانے اس کا جسم کس چیز سے بنا ہے کہ جس پر کوئی چوٹ اثر انداز ہی نہیں ہو رہی۔ حیر
تو اس بات کی ہے کہ کسی بھی قسم کی ضرب لگنے پر اس کے منہ سے کوئی آواز بھی نہیں نکلتی! بالکل
لگتا ہے جیسے اسے کوئی سانپ سونگھ گیا ہو'' آفریدی صاحب نے وضاحت کی۔

عامر اور ٹیپو بھی ان کے نزدیک بیٹھے بڑے غور سے یہ گفتگو سن رہے تھے۔

''میرے ذہن میں ایک بات آئی ہے جناب'' عامر نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

''کیا؟'' سب کے منہ سے ایک ساتھ نکلا تھا۔

''یہ بھی تو ممکن ہے کہ اس نے جسم کو بے حس کرنے والی کوئی دوائی نگل رکھی ہو۔ جس
کے قبضے سے ایسا خطرناک کیمیکل پاؤڈر برآمد ہوا ہے اس سے کسی بھی بات کی توقع کی جا
ہے۔ اور یہ بات بھی ہمارے ذہن میں ہونی چاہئے کہ وہ کسی عام مجرم قسم کے گروہ سے
نہیں رکھتا۔ یہ بڑے تربیت یافتہ لوگ ہیں'' عامر نے اپنی بات ختم کرتے ہوئے کہا۔

''شاباش میرے مٹی کے شیر۔ کبھی کبھی تو تم واقعی کمال کر دیتے ہو'' علی نے اسے داد دی

''جی ہاں۔ کبھی کبھی ان سے ایسی غلطی ہو ہی جاتی ہے جس کے لئے پھر شرمندہ نہ
پڑے'' ٹیپو نے کہا۔

''ویسے میری کوشش بھی ہوتی ہے کہ ایسی غلطیاں ہوتی ہی رہا کریں تاکہ آپ کو میر

متعلق جو غلط فہمی ہے وہ کم از کم دور ہو جائے'' عامر نے کہا۔

''یہ کیا غلطیوں کی گردان شروع کر دی ہے؟ اچھا بھئی اب روٹھ نہ جانا۔ تم واقعی بہت ذہین
بچے ہو'' علی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''مجھے اپنے متعلق ایسی کوئی غلط فہمی نہیں ہے جناب'' عامر نے تنک کر بولا۔

''میرا خیال ہے اب کوئی کام کی بات بھی ہو جائے'' کیپٹن علی نے کہا۔

''ضرور کیجئے۔ آرام تو آپ نے ہم پر حرام کر ہی دیا ہے۔ اب تو بس کام ہی کام ہے۔ سو ہم
کر ہی رہے ہیں''۔ عامر نے جلے کٹے لہجے میں کہا۔

وہ اور ٹیپو اس وقت ایک مقامی سرکس کا شو دیکھنے جا رہے تھے۔ جس کے لئے انہوں نے
اگلے ہی روز ٹکٹ بک کروا لئے تھے۔ عین وقت پر آئی جی مسٹر آفریدی اس مسئلے سمیت ان کے
پاس پہنچ گئے اور اب انہیں بادل نخواستہ اپنا پروگرام منسوخ کرنا پڑا تھا۔

''ایک تو تم نے آج کل نہ جانے بات بات پر رونا کیوں شروع کر دیا ہے'' کیپٹن علی نے
اس کو چھیڑنے کے انداز میں کہا۔

''آپ کی صحبت کا اثر ہے جناب' ورنہ میری کیا مجال'' عامر نے برجستہ جواب دیا۔

''یار' میری صحبت کا کوئی اچھا اثر بھی قبول کر لیا کرو'' علی بولا۔

''جی ہاں۔ یہ اس اچھے اثر کی وجہ ہی ہے آج کل ہماری نیندیں اور تفریح بھی آپ کے
قبضہ قدرت میں چلی گئی ہے۔ زندگی میں اول میں تفریح کا موقع ہی نہیں آتا۔ اگر آ بھی جائے تو
عین وقت پر کوئی کام آن پڑتا ہے۔''

''دراصل آپ کو حالات کی نظر لگ گئی ہے'' آئی جی صاحب نے انکی گفتگو سے لطف اندوز
ہوتے ہوئے مداخلت کی۔

''بھئی' کسی نہ کسی کو تو کام کرنا ہے۔ اگر ہم بھی آرام کے چکر میں پڑ گئے تو پھر سب گئے کام
سے'' کیپٹن علی نے ہنستے ہوئے کہا۔

''یہ ہوئی نہ کام کی بات'' آئی جی صاحب ہنس دیئے۔

تھوڑی دیر تک اس معاملے کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لینے کے بعد وہ اٹھ کر چلے گئے۔

تینوں حوالات کی طرف جا رہے تھے۔ جہاں پیٹرک کو قید رکھا گیا تھا۔

ان کی شکل پر نظر پڑتے ہی انچارج انسپکٹر نے سلیوٹ مار کر انہیں احترام دیا۔ گاڑی سے اتر کر وہ انسپکٹر کی معیت میں اس سیل کی طرف چل دیئے جہاں پیٹرک کو قید رکھا گیا تھا۔ راستے میں انسپکٹر انہیں بتاتا جا رہا تھا کہ یہ بڑا سخت جان ملزم ہے اور ''تھرڈ ڈگری'' کا ہر حربہ اس پر استعمال کیا جا چکا ہے مگر کیا مجال کہ وہ ایک لفظ بھی بولنے کے لئے تیار ہو۔

چند منٹ بعد تینوں اس کوٹھری کے سامنے کھڑے تھے جہاں پیٹرک دیوار سے لگ کر دروازے کی طرف منہ کئے بیٹھا تھا۔ انہیں اپنی طرف آتے دیکھ کر اس نے اپنی جگہ سے جنبش بھی نہیں کی تھی۔

''تم کچھ نہیں بتاؤ گے؟'' کیپٹن علی نے دروازے کی سلاخوں کے نزدیک پہنچ کر اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

''مجھے کچھ معلوم نہیں۔ آپ کون لوگ ہیں؟ مجھے کیوں پکڑ لائے ہیں؟ میں کسی کو نہیں جانتا میں نے کوئی جرم نہیں کیا۔ میرے گھر سے کچھ برآمد نہیں ہوا۔ آخر آپ لوگ میرے ساتھ زیادتی کرنے پر کیوں تلے ہوئے ہیں'' پیٹرک نے اس طرح لاپروائی سے کہا جیسے ناک سے مکھی اڑا رہا ہو۔

''دیکھو زیادہ چالاک بننے کی کوشش نہ کرو۔ ہیبت خاں گرفتار ہو چکا ہے۔ اس نے ہمیں سب کچھ بتا دیا ہے۔ تمہارے خلاف اتنے ثبوت ہمیں مل چکے ہیں کہ تم ساری زندگی جیل میں سڑتے رہو گے'' علی نے اس پر اپنی دانست میں بڑا نفسیاتی حملہ کیا تھا لیکن پیٹرک کے کان پر جوں تک نہ رینگی۔ کیا مجال جو اس کے چہرے کا رنگ ذرا بھی تبدیل ہوا ہو۔

''اول تو میں کسی ہیبت خاں نام کے آدمی کو جانتا ہی نہیں۔ پھر مجھے یہ سمجھ نہیں آتی کہ آپ کو اس نے میرے متعلق سب کچھ بتا دیا ہے تو آپ نے یہاں آنے کی زحمت ہی کیوں ہے۔ اگر کوئی ایسی بات آپ جاننا چاہتے ہیں تو پھر اسی سے پوچھ لیجئے۔ مجھے کیوں مصیبت

ال رکھا ہے'' اس نے بڑے طنزیہ لہجے میں کہا ''یہ بے چارے الگ پریشان ہو رہے ہیں'' اس نے علی کے نزدیک کھڑے انسپکٹر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''اس کا مطلب ہے کہ گھی سیدھی انگلیوں نہیں نکلے گا'' کیپٹن علی بولا۔

''گھی کہاں جناب' یہاں تو سر میں لگانے کیلئے تیل نہیں ملتا۔ میرے سر کی حالت آپ دیکھ رہے ہیں۔ ان لوگوں نے اس کے ساتھ کیا سلوک کیا ہے'' اس نے دوبارہ علی کا تمسخر اڑایا۔

''تم بہت چالاک بنتے ہو لیکن اس بات کا خیال رکھنا کہ میں اپنی تفتیش کا آغاز اس وقت کروں گا جب اس دوا کا اثر ختم ہو جائے گا جو تم نے نگل رکھی ہے'' کیپٹن علی نے گو کہ ہوا میں تیر چلایا تھا لیکن عین نشانے پر لگا۔ دوا کا لفظ اس کے منہ سے ادا ہوتے ہی پیٹرک کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔

''کیا مطلب؟ کس دوائی کی بات آپ کر رہے ہیں جناب؟ میں نے کہا تھا کہ یہاں تو سر پر لگانے کیلئے تیل نہیں ملتا'' پیٹرک نے سنبھلنے کے لئے دوبارہ علی پر طنز کی جو بڑے تحمل سے اسکی گفتگو سن رہا تھا۔ لیکن عامر کو تو غصہ آ گیا۔

''زیادہ بڑھ چڑھ کر باتیں نہ کرو۔ ہم اس دوا کی بات کر رہے ہیں جو تم نے اپنے جسم کو وقتی طور پر بے حس کرنے کے لئے نگل رکھی ہے اور جس کا نشہ دو یا تین روز بعد اتر جائے گا۔ تم بہت مکار بننے لگے تھے اور یہ سمجھتے تھے کہ جب تین چار روز تک پولیس تمہیں مار مار کر تنگ آ جائے گی تو اسے یقین آ جائے گا کہ تم واقعی بے گناہ ہو اور غلطی سے پکڑے گئے ہو۔ لیکن یاد رکھو ہم اس دوا کا اثر ابھی ختم کر دیں گے اور اپنی تفتیش کا آغاز تم پر ابلتا ہوا تیل پھینک کر کریں گے۔ اسے سر میں لگا لینا یا پھر سر کو اس میں ڈبو لینا۔ اس طرح تمہاری یہ شکایت بھی تمہارے ساتھ ہی ختم ہو جائے گی کہ تمہیں یہاں تیل نہیں ملتا۔ یاد رکھو ہم اپنے وطن کے دشمنوں کو کبھی معاف نہیں کیا کرتے۔''

جوں جوں عامر بولتا جا رہا تھا اس کا پارہ چڑھتا جا رہا تھا۔ غصے سے اس کے چہرے کا رنگ سرخ ہونے لگا تھا جبکہ پیٹرک کا چہرہ زرد پڑنے لگا تھا۔ یہ انکشاف ہی اس کی جان نکال دینے کے لئے کافی تھا کہ ان لوگوں کو علم ہو چکا ہے کہ اس نے مار کی اذیت سے بچنے کے لئے دوا استعمال کی

ہے۔ اسے اس خیال ہی سے وحشت ہونے لگی تھی کہ جب نارمل ہونے پر اسے اتنی مار برداشت کرنا پڑی تو اس کا کیا حال ہوگا؟ لہٰذا اس نے چپ چاپ ہتھیار ڈال دینے ہی میں بہتری سمجھی تھی۔

''آخر آپ لوگ چاہتے کیا ہیں؟ اس نے بظاہر زچ ہو کر کہا۔

''ہم سچائی جاننا چاہتے ہیں۔ تمہارا ہیبت خاں کے گروہ سے کیا تعلق تھا؟ کیمیکل پاؤڈر کا کیا ہے؟ وہ تم تک کیسے پہنچا؟'' کیپٹن علی نے کہا۔

لیکن اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ یہ سب کچھ بتا دینے کے بعد میں زندہ بھی رہ سکوں گا؟ اس مرتبہ پیٹرک کا لہجہ بالکل بدلا ہوا تھا۔

''کیا مطلب ہے تمہارا؟'' عامر نے کہا۔

''جناب' ہیبت خاں تو اس طاقت کا ادنیٰ سا غلام ہے جس کا تعلق اس کیمیکل پاؤڈر سے۔ جو آپ نے میرے گھر سے برآمد کیا ہے۔ یہ تو اس کا معمولی حربہ تھا۔ وہ طاقت ہیبت خاں کے ذریعے بچوں کے اغوا کی وارداتیں اس لئے کروا رہی تھی کہ آپ کے ملک میں خوف و ہراس پیدا کر سکے۔ اس طرح خوف و ہراس پیدا کر کے وہ اپنے گھناؤنے مقاصد کو بروئے کار لانا چاہتا تھا۔ دراصل آپ کے ملک کو تباہ کرنے کے منصوبے کا آغاز اس طرح کیا گیا ہے'' پیٹرک نے کھڑکی ہو کر سلاخوں کے نزدیک آ کر بڑی رازداری سے کہا۔

''کون ہے وہ طاقت؟'' کیپٹن علی نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

''دیکھئے۔ یہ جگہ بالکل غیر محفوظ ہے۔ آپ مجھے یہاں سے کہیں اور لے جائیے۔ میں آپ کو اپنی زندگی کی ضمانت پر سب کچھ بتا دوں گا'' پیٹرک نے بڑی خوف زدہ نظروں سے چاروں اطراف کا جائزہ لے کر کہا۔

''گھبراؤ نہیں۔ تم بالکل محفوظ ہو۔ یہاں کوئی تمہیں کچھ نہیں کہے گا۔ اگر تم ہمارے ساتھ تعاون کرو گے تو ہم تمہارے لئے ضرور کوئی راستہ نکال لیں گے'' عامر نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

''آپ نہیں سمجھ سکتے جناب۔ خدا کے لئے مجھے جلد از جلد یہاں سے نکال کر کہیں بھی لے جائیے۔ میں آپ سے زیادہ بہتر سمجھتا ہوں۔ یہ جگہ میرے لئے بالکل غیر محفوظ ہے'' پیٹرک نے پل تک بڑا سخت جان ملزم ثابت ہو رہا تھا' سہمے ہوئے بچے کی طرح خوف زدہ نظروں سے سلاخوں کے باہر جھانکتے ہوئے کہا۔ بات کرتے ہوئے اس کے چہرے کا رنگ ہلدی کی طرح زرد ہو رہا تھا۔

''اچھا' چلو۔ کہیں اور چلتے ہیں'' کیپٹن علی نے گردن موڑ کر عامر کو آنکھ سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

کیپٹن علی کے اشارے پر انسپکٹر نے ایک سپاہی کو آواز دی۔ جس نے حوالات کے دروازے پر پڑا تالا کھول دیا اور اس کے دونوں ہاتھوں کو ہتھکڑی لگا کر باہر نکال لیا۔ اس نے سپاہی کو سمجھا تھا کہ پیٹرک کو اسکی گاڑی کی طرف لے جائے۔ علی کا خیال تھا کہ اگر پیٹرک یہاں کچھ نہیں بتانا چاہتا تو وہ اسے اپنے ساتھ کسی محفوظ ٹھکانے پر لے جائیں گے جہاں جا کر وہ شاید زیادہ اطمینان سے گفتگو کر سکے۔

سپاہی اور پیٹرک آگے آگے چل رہے تھے۔ سپاہی نے اس کی ہتھکڑی اپنے ہاتھ میں پکڑ رکھی تھی۔ علی اپنے دونوں ساتھیوں کے ساتھ انسپکٹر کو کچھ ہدایات دینے کے بعد ان کے تعاقب میں آ رہا تھا۔ جب اچانک اس نے پیٹرک کو لڑکھڑا کر گرتے دیکھا۔ اس کے ساتھ ہی سائیں کی آواز سماعت کرتی ہوئی ایک گولی اس کے کان کے نزدیک سے گزر گئی۔

اس نے ٹیپو کو دائیں طرف دھکا دے کر گرا دیا تھا۔ عامر نے بائیں طرف چھلانگ لگائی تھی اور کیپٹن علی ماہر کمانڈو کی طرح وہیں زمین سے چپک کر رہ گیا اس نے گرتے گرتے اپنے ہولسٹر سے پستول نکال لیا تھا۔

زمین پر لیٹے لیٹے علی نے اندازے سے دو تین فائر مختلف اطراف میں کئے۔ اس کے ساتھ ہی وہ اٹھ کر حوالات کے دروازے کی طرف بھاگا۔ اس دوران اس نے دیکھ لیا تھا کہ پیٹرک کے ساتھ ہی سپاہی بھی زمین پر ڈھیر ہو چکا تھا۔ علی برق رفتاری سے دوڑتا ہوا دروازے کے باہر تک

آیا جہاں کسی حملہ آور کا نام ونشان تک نظر نہیں آ رہا تھا۔ واپسی پر اس نے دیکھا سپاہی تو بے چار
دم توڑ چکا تھا۔ پیٹرک لمبے لمبے سانس لے رہا تھا۔ کسی نے سائلنسر لگی طاقت ور رائفل سے گولیاں
چلائی تھیں۔ اور حملہ آور کا نشانہ ایسا شاندار تھا کہ دونوں کے عین دل پر گولیاں لگی تھیں۔ حوالات
عملہ حواس باختہ ہو کر چاروں اطراف میں بھاگ رہا تھا۔ علی پیٹرک کے نزدیک جھک کر بیٹھ گیا۔

''ڈاک ٹر.....ٹاں.....گو'' پیٹرک نے لڑکھڑاتی زبان سے بمشکل یہ الفاظ ادا کئے تھے کہ
اسکی گردن ایک طرف ڈھلک گئی۔ اسکی پھٹی پھٹی آنکھیں کیپٹن علی سے کہہ رہی تھیں ''میں نہ کہتا
کہ میں یہاں غیر محفوظ ہوں!!'' کیپٹن علی نے تاسف بھری نظر اسکی لاش پر ڈالی پھر اٹھ کر کھ
ہو گیا۔ اسے پیٹرک سے زیادہ اس سپاہی کے مرنے کا افسوس تھا جو بالکل بے گناہ مارا گیا تھا۔
نے چند ثانیے کھڑے ہو کر کچھ سوچا پھر دوبارہ بیٹھ کر لاشوں کا معائنہ کرنے لگا۔ اب عامر اور ٹیپو
اٹھ کر کپڑے جھاڑتے اسکے قریب آ کر کھڑے ہو گئے تھے۔

تھوڑی ہی دیر بعد وہاں شہر کے قریباً سب ہی اعلیٰ افسران پہنچ چکے تھے۔ پیٹرک کے
طرح مارے جانے پر سب ہی پریشان دکھائی دے رہے تھے۔ کیونکہ ایک وہی بظاہر ایسا ملزم
آ رہا تھا جس سے پاؤڈر کے متعلق کسی اطلاع کی امید کی جا سکتی تھی۔

علی کی ہدایت پر پولیس کے فوٹو گرافروں نے لاشوں کی تصاویر بنائیں پھر لاشوں کو پو
مارٹم کیلئے ہسپتال بھیج دیا گیا۔

واپسی کا سفر تینوں نے خاموشی سے طے کیا تھا۔ علی کے ذہن میں ابھی ایک اور کلو باقی
اس نے اب ہیبت خاں پر قسمت آزمائی کا فیصلہ کیا تھا۔ ہیبت خاں کی نگرانی کیلئے علی نے ا
اعتبار کے اور کافی آدمی متعین کئے تھے۔ اسے ایک خفیہ ٹھکانے پر رکھا گیا تھا اور ابھی تک اخ
نمائندوں کو بھی اس سے ملاقات کی اجازت نہیں دی گئی تھی۔

مشتبہ نائب

رات کے بارہ بجنے کو تھے اور وہ سب ابھی تک میز پر پھیلے ہوئے ایک بڑے سے نقشے پر
جھکے ہوئے تھے۔ ولیم نے اپنے ہاتھ میں ایک پنسل پکڑی ہوئی تھی۔ اور وہ نقشے پر نظریں گاڑے
عامر اور ٹیپو کو مختلف مقامات پر پنسل رکھ رکھ کر یہ سمجھا رہا تھا کہ انہیں کن کن جگہوں سے گزرنا ہے۔
وہاں کیسے کیسے لوگوں اور جانوروں سے واسطہ پڑے گا اور موسمی حالات کیا ہوں گے۔ نشان زدہ
مقامات پر وہ رک جاتا۔ ایک لمحے کے لیے ایسا دکھائی دیتا جیسے وہ کچھ سوچ رہا ہو۔ پھر وہ ان لوگوں
کو اس جگہ کے متعلق بتانے لگتا کہ سب سے پہلے وہ کب یہاں گیا تھا اور اسے کن واقعات کا سامنا
کرنا پڑا تھا۔ کیپٹن علی ایک کونے میں رکھی ہوئی آرام دہ کرسی پر بیٹھا بڑے انہماک سے اس کی
باتیں سن رہا تھا اور دل ہی دل میں ولیم کی معلومات کی داد بھی دے رہا تھا۔

یوں دکھائی دیتا تھا جیسا ولیم کی شکل میں ان کے سامنے کوئی انسائیکلوپیڈیا دھرا ہو۔ ٹیپو کے
علاوہ عامر بھی اس کی گفتگو میں بڑی دلچسپی لے رہا تھا اور یہ بات کیپٹن علی کیلئے خلاف توقع تھی۔
عموماً عامر خود پر غیر سنجیدگی ہی طاری رکھتا تھا۔ جنگلی جانوروں اور جنگلات سے متعلق تو ولیم کی
معلومات جان کر کیپٹن علی کو اچھی طرح سمجھ آ گئی تھی کہ وہ ڈاکٹر ٹانگو کیلئے کتنے کام کا آدمی رہا ہوگا۔

شام کو چائے پینے کے بعد لوگ نقشے کے گرد اکٹھے ہو گئے تھے۔ یہ نقشہ ولیم نے ان کے لئے دو روز میں بڑی محنت سے تیار کیا تھا کیونکہ علی کی یہ خواہش تھی کہ جس سفر پر وہ لوگ جانے والے ہیں اس کے متعلق کم از کم ابتدائی معلومات تو اس کے ساتھیوں کو مل جائیں۔ رات گئے تک کسی کو کھانے کا ہوش نہیں رہا تھا۔ اس دوران دو تین مرتبہ باورچی نے آ کر کھانے کے متعلق دریافت کیا تھا لیکن علی نے اسے کہہ دیا تھا کہ وہ آرام کرے۔ جب ان لوگوں کو ضرورت ہو گی وہ خود کھا کھا لیں گے۔

جیسے ہی دیوار پر لگے کلاک نے رات کے بارہ بجے کا اعلان کیا' عامر اپنی جگہ کھڑا کھڑ اچانک لڑکھڑایا اور بڑی ہوشیاری سے زمین پر گرنے کے بجائے نزدیک صوفے پر ڈھیر ہو گیا۔ ٹی اور کیپٹن علی نے تو سرسری نظر اس پہ ڈالی اور اپنی توجہ دوسری طرف مبذول کر لی۔ وہ جانتے تھے کہ عامر ایسی شرارتیں اکثر کرتا رہتا ہے۔ خصوصاً کیپٹن علی کو تو اس کی ہر حرکت کا علم پہلے ہی سے ہو جا کرتا تھا لیکن ولیم کے لئے یہ بڑی پریشان کن صورتحال تھی۔ وہ یہی سمجھا کہ عامر پر شدید کوئی دو پڑا ہے اور وہ بے ہوش ہو گیا ہے۔ بے چارا بڑی تیزی سے اس کی مدد کو عامر کی طرف بڑھا۔

''پ.....پ.....پانی.....'' عامر نے اسے دیکھتے ہی بے ہوشی کی باقاعدہ ایکٹنگ شرو کر دی۔

ولیم بڑی تیزی سے کچن کی طرف بھاگا۔ اس دوران ٹیپو اور علی اس سے بالکل لاتعلق ہو اپنی جگہ بیٹھے رہے۔ جیسے ہی ولیم پانی کا گلاس تھامے گھبراتا ہوا کمرے میں واپس پلٹا' علی اسے اپنی طرف آنے کا اشارہ کیا اور اس سے پانی کا گلاس لے کر سارا گلاس غٹا غٹ پی گیا۔ گھبراہٹ اور بے چارگی کے عالم میں کبھی عامر اور کبھی علی پر نظریں ڈال رہا تھا۔ ابھی تک اسے کی اس حرکت کی وجہ سمجھ میں نہیں آئی تھی۔

''بے ہوش میں ہوا جناب' آپ نہیں!'' عامر نے اچانک صوفے سے اٹھتے ہوئے عل مخاطب کیا تو ولیم کو صورتحال کی سمجھ آ گئی اور وہ مسکرا کر رہ گیا۔

''کس نے کہا تھا آپ سے بے ہوش ہونے کو۔'' علی بولا۔

''اس نے!'' عامر نے اپنے پیٹ پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

''کیا ہوا تھا اسے!'' علی نے حیرانگی سے پوچھا۔

''بو.....بو.....بھوک!'' عامر نے ہکلاتے ہوئے جواب دیا۔

''یہ کس جانور کا نام ہے؟'' علی نے اس مرتبہ ولیم کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

''میرے علم میں تو اس نام کا کوئی جانور نہیں ہے۔'' ولیم نے ان کے مذاق میں حصہ لیتے ئے کہا۔

''آپ تو ہوا سے بھی پیٹ بھر سکتے ہیں۔ لیکن مجھے کس بات کی سزا دے رہے ہیں۔'' عامر نے دوبارہ صوفے پر ڈھیر ہوتے ہوئے علی سے دریافت کیا۔

''اوہ ہو! تو یوں کہو ناں کہ تمہیں بھوک لگی ہے۔ خیر اب تو آدھی رات ہونے کو ہے۔ صبح ٹھے کھا لینا'' علی نے بظاہر لاپرواہی سے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے! ٹھیک ہے!'' ٹیپو اور ولیم نے بھی اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔

''اف میرے خدایا! میں کہاں آن پھنسا۔'' عامر نے اپنے ماتھے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

''آپ تو کہیں پھنس ہی نہیں سکتے انکل!'' ٹیپو نے ہنستے ہوئے کہا۔

''لیکن جب واسطہ تمہارے انکل علی سے ہو تو بچ بھی نہیں سکتا۔'' عامر نے بے بسی سے اب دیا۔

''چلو چھوڑو' کوئی کام کی بات بھی کر لیں۔ ہاں' تو ولیم تم کیا کہہ رہے تھے اس قبیلے کے لق؟'' علی نے ولیم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''جناب! یہ آدم خوروں اور جنگلوں کے خوف ناک تذکرے تو اچھے بھلے آدمی نہیں سن سکتے' ریہاں خالی پیٹ کیا خاک پلے پڑے گا۔'' عامر بولا۔

''یہ آپ نے پیٹ سے کب سے سننا شروع کر دیا۔'' علی نے اس سے پوچھا۔

''انکل آج کل یوگا کر رہے ہیں۔'' ٹیپو بولا۔

''چہ چہ! مجھے تو اس وقت سے ڈر لگ رہا ہے جب تم منہ کے بجائے کانوں سے بولو گے اور

کانوں کی بجائے تم منہ سے سنو گے۔'' علی نے اس کی حالت پر افسوس ظاہر کیا۔

''اگر مزید پانچ منٹ تک کچھ کھانے کو نہ ملا تو یہ نوبت بھی آ سکتی ہے۔'' عامر نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے' تو پھر پاگل خانے کی ایمبولینس منگوالیں۔'' علی نے مشورہ طلب نظروں اپنے ساتھیوں سے پوچھا اور سب کھلکھلا کر ہنس دیئے۔

ان کی نوک جھونک جاری تھی جب رات کے چوکیدار نے کھانا لگنے کی اطلاع دی۔ا سب کھانے والے کمرے کی طرف چل دیئے۔ابھی انہوں نے بمشکل چند لقمے ہی لگائے جب اچانک فون نے ٹرانا شروع کر دیا۔عامر نے فون کی طرف اس طرح گھور کر دیکھا جیسے کچا ہی چبا جائے گا۔علی نے اٹھ کر فون اٹھایا۔

''ہیلو!'' دوسری طرف سے کمانڈر انچیف کی آواز سن کر علی کے چہرے کا رنگ ایک کیلئے بدلا بدلا لیکن پھر وہ نارمل ہوگیا۔اس وقت کمانڈر انچیف کا براہ راست فون کرنا کوئی شگون نہیں تھا۔ضرور کوئی خطرناک بات تھی۔

''ایک ایمرجنسی میٹنگ ہے۔فوراً بعد ہیڈ کوارٹر پہنچو۔'' دوسری طرف سے حکم ملا۔

''او۔کے سر! کہہ کر علی نے فون رکھ دیا۔

''کوئی نئی مصیبت۔'' عامر نے چھٹتے ہی دریافت کیا۔

''فوراً اٹھو اور میرے ساتھ ہیڈ کوارٹر چلو۔ایک ہنگامی میٹنگ میں ہمیں طلب کیا گیا علی بولا۔

''واہ ری قسمت!'' عامر نے کہتے ہوئے دو چار لقمے زہر مار کئے اور تھوڑی ہی دیر دونوں آرمی ہیڈ کوارٹر کی طرف اپنی گاڑی اڑائے چلے جا رہے تھے۔

☆☆☆☆☆

آرمی ہیڈ کوارٹر کے جس کمرے میں وہ پہنچے' یہ ایک زمین دوز کمرہ تھا انتہائی اہم میٹنگ ہوا کرتی تھیں۔اس کمرے میں پہنچتے ہی عامر کا ماتھا ٹھنکا۔وہ صرف ایک مرتبہ پہلے یہاں

تب بھی صورت حال بہت خطرناک تھی۔صورت حال کی سنگینی کا احساس ہوتے ہی عامر نے بھی سنجیدگی اختیار کر لی۔جس سیکوریٹی آفیسر کی نگرانی میں وہ یہاں پہنچے تھے وہ انہیں دروازے پر چھوڑ کر سیلوٹ کر کے اپنی جگہ واپس چلا گیا۔دروازے کے باہر سرخ بلب بھی روشن تھا جس کا مطلب تھا کہ اندر میٹنگ جاری ہے۔

اندر داخل ہونے پر جب کیپٹن علی کی نظر یہاں موجود دو تین چہروں پر پڑی تو وہ چونکے بغیر نہ رہ سکا۔

''یا الٰہی خیر!'' اس نے دل ہی دل میں کہا۔

سب سے پہلے اس سے جنرل زاہدان نے اٹھ کر ہاتھ ملایا۔جنرل زاہدان انکے ایک دوست ملک کے خفیہ محکمے کے سربراہ تھے۔علی اور زاہدان کبھی آکسفورڈ میں اکٹھے پڑھتے رہے تھے۔گو کہ جنرل زاہدان ان سے بہت سینئر تھے لیکن دونوں اچھے دوست تھے اور ایک دوسرے کے متعلق عموماً باخبر رہا کرتے تھے۔جنرل زاہدان کا تعلق مڈاشا سے تھا۔

مڈاشا افریقہ کا ایک ملک تھا جس کے علی کے ملک سے بڑے گہرے مراسم تھے۔مڈاشا میں موجود تیل کے ذخائر پر بڑے بڑے ملکوں کی نظریں لگی ہوئی تھیں۔اور وہ ملک یہ نہیں چاہتے تھے کہ مڈاشا علی کے ملک کی مدد کرے جب کہ مڈاشا کی حکومت ساری دنیا کی دشمنی مول لیکر بھی علی کے ملک کی مدد کرتی رہتی تھی۔

جنرل زاہدان کیپٹن علی سے بڑی گرمجوشی سے بغل گیر ہوا تھا۔علی نے اس سے عامر کا تعارف کروایا کیونکہ اس سے پہلے زاہدان نے عامر کو دیکھا نہیں تھا لیکن اسکی شہرت ضرور سن رکھی تھی۔کمرے میں جنرل زاہدان کے علاوہ علی کے ملک کے وزیر خارجہ، آرمی کے کمانڈر انچیف، اور تین چار اعلیٰ افسران موجود تھے۔تعارف کے بعد کاروائی کا باقاعدہ آغاز ہوا اور وزیر خارجہ نے اٹھ کر کہنا شروع کیا۔وہ علی اور عامر سے مخاطب تھے۔وہ کہہ رہے تھے:۔

''مڈاشا سے ہمارے تعلقات کا آپ سب کو بخوبی علم ہے۔جب سے دنیا کے خطرناک مجرم ڈاکٹر ٹانگو کو تمہارے ہاتھوں پے در پے زک اٹھانی پڑی ہے اور اس کا دست راست دانگلے

یہاں مارا گیا ہے وہ ہمارے خلاف اوچھے اور خطرناک ہتھکنڈے استعمال کر رہا ہے۔ ہمار
ملک میں ڈاکٹر دانگلے کے ہیڈ کوارٹر کی تباہی نے اسے بوکھلا کر رکھ دیا ہے۔ وہ یہاں تو کچھ کر نہیں
سکتا۔ اس نے ہمارے دوست مڈاشا کو اپنی تخریب کاری کا نشانہ بنانا شروع کر دیا ہے اور ا
دھمکیاں دی جا رہی ہیں کہ وہ ہماری اہم صنعتوں کی تعمیر میں دی جانیوالی امداد بند کر دے۔ ڈا
ٹانگو نے کل دوپہر کو ہمارے ملک کے سفیر کو مڈاشا میں گولی مار دی ہے اور بڑی دیدہ دلیری سے ا
واردات کی ذمہ داری بھی قبول کر لی ہے۔ اس نے کہا ہے کہ اگر مڈاشا نے ہماری امداد جاری رکھ
وہ اپنا خطرناک ترین ہتھیار مڈاشا کے دشمن ہمسایہ ملک موغاشو کو سپلائی کر دے گا۔ تم جانتے ہو
موغاشو کے عزائم ہمارے دوست ملک مڈاشا کے متعلق کتنے خطرناک ہیں۔ اگر ایسا ہو گیا تو مڈا
کی سلامتی خطرے میں پڑ جائے گی۔ اور ہم یہ برداشت نہیں کر سکتے کہ ہمارے لیے ہمارے
دوست ملک کی سلامتی خطرے میں پڑے جائے۔''

وزیر خارجہ کی خاموشی کے بعد مڈاشا کی خفیہ پولیس کے سربراہ جنرل زاہدان اٹھ کر کھڑ
ہوئے اور انہوں نے کیپٹن علی کو مخاطب کرتے ہوئے کہنا شروع کیا:

''میں یہ بات واضح کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ دنیا کی کوئی طاقت ہمارے اور آپ
درمیان اختلاف پیدا نہیں کر سکتی۔ ہمیں اپنے دوستوں کے لیے کوئی بھی قربانی دینی پڑے ہم
ہیں۔ اسوقت ہمارے لیے خطرے کی بڑی بات یہ ہے کہ ڈاکٹر ٹانگو نے اگر اپنے خطرناک ہتھ
ہمارے دشمن ملک موغاشو کو دے دیے تو وہ ہمارے لیے بہت سے خطرات پیدا کر دے گا کیو
موغاشو کے ہندوؤں اور یہودیوں سے بڑے گہرے مراسم ہیں اور یہ دونوں طاقتیں ہمیں
کرنے پر تلی ہوئی ہیں۔ اس لیے ہندوؤں اور یہودیوں کے ایجنٹ ڈاکٹر ٹانگو کو ختم کرنا ضرو
ہے۔ ہماری اطلاعات کے مطابق آجکل اس نے ہمارے ہمسایہ ملک موغاشو میں ڈیرے
رکھے ہیں۔ ہمیں ٹانگو کے خاتمہ کے لیے کیپٹن علی اور اس کے ساتھیوں کے تعاون کی ضرور
ہے۔'' جنرل زاہدان نے اپنی بات ختم کر کے جواب طلب نظروں سے علی کی طرف دیکھا۔

☆☆☆☆☆

اس دوران عامر نے ایک بات خاص طور سے محسوس کی کہ کیپٹن علی گو بڑے انہماک سے
اسکی تقریر سن رہا تھا لیکن وہ کن انکھیوں سے جنرل زاہدان کے سیکرٹری کا جائزہ مسلسل لے رہا تھا جو
زاہدان کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھا اس میٹنگ کے نوٹس لے رہا تھا۔ عامر کی چھٹی حس نے کسی
آنے والے خطرے کی نشان دہی کر دی تھی۔ کیونکہ کیپٹن علی کا اس طرح سے مسلسل جائزہ لینا
عموماً خطرے سے خالی نہیں ہوا کرتا تھا۔ جنرل زاہدان کی گفتگو کے خاتمے پر علی اپنی جگہ سے اٹھ کر
کھڑا ہو گیا۔

''آپ نے جس اعتماد کا اظہار مجھ پر کیا ہے اس کے لیے میں آپ کا شکر گزار ہوں کیونکہ
معاملہ ڈاکٹر ٹانگو کا ہے اور اس کے متعلق ہم میں سے کوئی بھی کسی غلط فہمی کا شکار نہیں۔ اس لیے ہمیں
ہر قدم پھونک پھونک کر اور بڑی احتیاط سے اٹھانا ہوگا۔ ہم اگر شروع ہی میں احتیاط نہ کریں گے تو
آگے چل کر ناکامی کا سامنا ہی کرنا پڑے گا۔ کوئی بھی تجویز آپ کے سامنے رکھنے سے پہلے میں
جنرل زاہدان کے سیکرٹری سے درخواست کروں گا کہ وہ میرے ساتھ باتھ روم تک آئیں۔''

بات کرتے کرتے اس نے اپنا ایک پاؤں عامر کے پاؤں پر رکھ دیا تھا اور اس کی گفتگو کے
دوران ہی عامر اپنی جگہ سے اٹھ کر باتھ روم کے نزدیک پہنچ گیا۔ وہ بالکل ایسے ہی لاپرواہی سے
اٹھا تھا جیسے کسی کام سے باتھ روم کی طرف گیا ہو۔ علی کی بات ختم ہوتے ہی وہاں موجود سب لوگوں
نے حیرانگی سے اس کی طرف دیکھا۔

''تم کیا کر رہے ہو!'' جنرل زاہدان نے چونک کر کہا۔

''کیپٹن علی تم.....'' علی کے ملک کے کمانڈر انچیف نے جو اس کے ساتھ والی کرسی پر بیٹھے
تھے، اسے مخاطب کرتے ہوئے حیرانگی سے کہا۔

ابھی اس کی بات مکمل بھی نہ ہوئی تھی کہ جنرل زاہدان کا نائب اچانک اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس
نے پستول سب کی طرف تان رکھا تھا:

''خبردار! کوئی اپنی جگہ سے نہ ہلے''۔ اس نے حاضرین کو تنبیہ کی۔

اب صورت حال یہ تھی کہ علی اور کمانڈر انچیف کے بالکل سامنے جنرل زاہدان اور اس کا

نائب براجمان تھے۔ دونوں کے درمیان میز تھی جس کے دونوں اطراف کرسیوں پر باقی لوگ بیٹ
تھے۔

جنرل زاہدان کی پشت پر ایچ باتھ روم کا دروازہ کھلتا تھا۔ جس کے ساتھ عامر علی کا اشا
سمجھتے ہی پوزیشن لے چکا تھا جنرل زہدان کا مشتبہ نائب شاید اس طرف سے بے خبر تھا کیونکہ عا
بالکل دبے پاؤں اور نامحسوس انداز میں اپنی جگہ سے علی کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی اٹھ کر
گیا تھا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ علی نے اسے کس لیے اس طرف بھیجا ہے اور اب اسے یہی کارنامہ انجا
دینا تھا۔

جیسے ہی مشتبہ نائب نے پستول نکالا، عامر نے اس کی پشت سے اچانک اس پر چھلانگ
لگائی اور دونوں پستول سمیت میز پر جا گرے۔ اس کے ساتھ ہی علی نے کمانڈر انچیف کو دھکا دے
کر کرسی سے نیچے گرا دیا۔ اگر وہ بجلی کی سی پھرتی سے ایسا نہ کرتا تو نائب کے پستول سے نکلنے وا
گولی سامنے دیوار میں لگنے کے بجائے کمانڈر انچیف کے سر میں گھس گئی ہوتی۔

عامر نے اس کا ہاتھ اتنی سختی سے مروڑا کہ پستول اس سے نکل کر نیچے جا گرا جو اب کیپٹن
کے ہاتھ میں تھا اور اس کا رخ مشتبہ نائب کی طرف تھا۔

''آپ نے میرے نائب کے ہاتھ بھی دیکھ لیے۔ اب اپنے نائب کا اصل روپ بھی د
لیجیے''۔ علی نے بڑے اطمینان سے جنرل زاہدان کو مخاطب کیا جو ابھی تک حیرانگی سے یہ سارا م
دیکھ رہے تھے۔

عامر نے اسے دونوں ہاتھوں سے اٹھا کر سامنے فرش پر پٹخ دیا۔ اب ایک کونے میں
اگلے حکم کا منتظر تھا۔ اس اثناء میں کمانڈر انچیف نے خطرے کا بٹن دبایا تھا کیونکہ اچانک ہی چار
گارڈ اندر گھس آئے تھے۔

''ٹھہریے!'' اس سے پہلے کہ وہ کوئی کاروائی کریں، علی نے ہاتھ اٹھا کر انہیں رکنے کا
دیا۔

''رک جاؤ!'' کمانڈر انچیف صاحب نے انہیں حکم دیا اور وہ اپنی جگہ جم کر کھڑے ہو گئے

''میرے خیال سے میرے دوست جنرل زاہدان اس کی اصلیت ضرور دیکھنا پسند کریں
ے''، علی نے نائب کی طرف اشارہ کیا اور اس کے نزدیک پہنچ گیا۔

اس نے اپنا ایک ہاتھ اسکی گردن کے نیچے کسی جگہ پر رکھا۔ پھر وہاں پر موجود تمام لوگوں نے
حیرت سے دیکھا۔ علی کے ہاتھ میں ایک جھلی سی نظر آ رہی تھی جو اس نے نائب کے منہ سے اتاری
تھی۔

''بوغا تم!'' جنرل زاہدان نے اس کی اصلی شکل پر نظر پڑتے ہی چونک کر کہا۔

ان کے سامنے دنیا کا خطرناک ترین مجرم بوغا کھڑا تھا جسے ڈاکٹر ٹانگو کے گروہ میں ایک اہم
مقام حاصل تھا۔

''ہاں میں!'' بوغا نے زوردار قہقہہ لگایا۔

یوں لگتا تھا جیسے اسے یہاں موجود لوگوں میں سے کسی کی کوئی پروا نہیں اور اس پر اس حادثے
کا کوئی اثر ہی نہیں ہوا۔

''جنرل!'' بوغا نے جنرل زاہدان کو مخاطب کیا۔ ''تمہارا نائب ہمارے عظیم سردار ڈاکٹر ٹانگو
کے قبضے میں ہے۔ تم بھی بہت جلد اس کے ہاتھوں مارے جاؤ گے''۔ اس نے دیوانہ وار قہقہہ بلند
کیا۔

''اوہ تم!'' وہ اب کیپٹن علی سے مخاطب تھا۔ ''تم بھی یہی سمجھو کہ تمہارے دن اب گنے جا
چکے ہیں۔ تم نے ہمارے دوست ڈاکٹر دانگلے کو مار ڈالا ہے۔ ڈاکٹر ٹانگو نے تمہاری موت کے
پروانے پر دستخط کر دیے ہیں۔ تم اس کے ہاتھ سے بچ نہیں سکتے کیپٹن علی!'' اس نے پھر زوردار
قہقہہ لگایا۔

''گرفتار کر لو اسے''۔ کمانڈر انچیف صاحب نے اپنے گارڈز کو حکم دیا۔

''ڈاکٹر ٹانگو کے ساتھی کبھی زندہ گرفتار نہیں ہوا کرتے۔ ہا ہا ہا.....''

بوغا نے زوردار قہقہہ لگایا اور اچانک دھڑام سے زمین پر گر پڑا۔ سب لوگ تیزی سے اس
کی طرف بڑھے۔ علی، عامر اور زاہدان جھک کر اس کے چہرے کی طرف دیکھ رہے تھے جس کی

رنگت اچانک نیلی پڑ گئی تھی۔

''زہر!'' علی نے اٹھ کر کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

سب لوگ اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔

''اس نے خطرناک زہر نگل لیا تھا۔ اس کا ایک دانت زہریلا تھا۔ عموماً بڑے بڑے ہم پولیس کی گرفت میں آنے پر زہر نگل لیتے ہیں اور ٹانگو کے ہر اہم ساتھی کا ایک دانت ایسا ہی ہے۔ اس نے حاضرین کو بتایا۔

تھوڑی دیر بعد بوغا کی لاش پوسٹ مارٹم کے لیے جا چکی تھی اور وہ لوگ اپنے اعصاب پرسکون کرنے کے لیے گرم گرم کافی پی رہے تھے۔

اجلاس صبح تک جاری رہا۔ اس دوران انہوں نے بہت اہم فیصلے کیے۔ جنرل زاہدان۔ بڑی ہمت سے خود کو نارمل کیا تھا۔ یہ حادثہ انکے لیے زبردست ذہنی جھٹکے کا باعث بنا۔ لیکن وہ حیرا تھا کہ علی کا نائب عامر اس دوران ان لوگوں کو مسلسل ہنسنے پر مجبور کرتا رہا۔ جنرل زاہدان دل ہی د میں ان لوگوں کو داد دیے بغیر نہ رہ سکا جو موت کی گود میں بیٹھ کر بھی مسکرا رہے تھے۔

صبح ہونے پر وہ لوگ اپنے اپنے ٹھکانے کی طرف روانہ ہو گئے۔ اس خفیہ اجلاس میں بہت اہم فیصلے کیے گئے تھے جن پر انہیں جلد از جلد عمل پیرا ہونا تھا۔

☆☆☆☆☆

دوپہر تک عامر گہری نیند سوتا رہا۔ علی نے اس کے منہ پر پانی کے چھینٹے مار کر گہری نیند۔ بیدار کیا تھا۔

''سو رہا تھا، بے ہوش نہیں تھا''۔ عامر نے اٹھ کر باتھ روم کی طرف جاتے ہوئے کہا۔

''میں تو اس سے بھی کچھ آگے سمجھ رہا تھا۔ جلدی سے تیار ہو جاؤ۔ جنرل زاہدان ہمار۔ ساتھ دوپہر کا کھانا کھانے آ رہے ہیں۔'' علی نے کہا۔

اس اطلاع کا شکریہ! لیکن آپ یہ بات ذرا آرام سے بھی بتا سکتے تھے۔'' عامر نے باتھ ر میں گھستے ہوئے کہا۔

کھانے کی میز پر علی نے زاہدان کا تعارف اپنے ساتھیوں سے کروایا۔ جنرل زاہدان نے ٹیپو کے کارنامے تو سنے ہوئے تھے، اس کی عمر دیکھ کر حیران ہی رہ گئے۔ ولیم کے متعلق بھی اس نے جنرل زہدان کو سب کچھ بتا دیا تھا۔ کھانے کے خاتمے پر اس نے جنرل زاہدان سے کہا۔

''ہم اپنا سفر الگ الگ کریں گے۔ آپ کو اندازہ تو ہو گیا ہو گا کہ ٹانگو کے ہاتھ کتنے لمبے ہیں۔''

''ہاں! میں بھی یہی بات کہنے والا تھا۔'' جنرل زاہدان بولے۔

''آپ کل ہی ہوائی جہاز سے چلے جائیں۔ ہم لوگ بحری جہاز کے ذریعے ڈاشا پہنچیں گے۔ ہم تاجروں کے روپ میں سفر کریں گے۔ میری ایک درخواست بھی ہے''۔

''کیا؟'' جنرل زاہدان ہمہ تن گوش تھے۔

''ہماری آمد کی کسی کو بھی کانوں کان خبر نہ ہو۔ میرا مطلب ہے یوں نہ ہو کہ آپ خود ہی ہمارے استقبال کو بندرگاہ چلے آئیں۔ آپ کے ملک میں سوائے ایک دو اہم ترین شخصیات کے اور کسی کو اس دورے کا علم نہ ہونے پائے، کیونکہ ٹانگو کے ہاتھ بہت لمبے ہیں اور وہ اعلیٰ سرکاری افسروں کو اپنے ہاتھ میں ضرور رکھتا ہے۔'' علی نے کہا۔

''تم بے فکر رہو علی! ہم تمہارے ہر فیصلے کا احترام کریں گے۔'' جنرل زاہدان نے کہا۔

تعاقب اور ٹکراؤ

اس جہاز کا نام ''مڈغاسکر'' تھا جس پر انہیں سفر کرنا تھا۔ یہ بحری سفر ایک ماہ پر محیط تھا۔ عامر تو اتنے لمبے سفر کے ذکر پر بھڑک اٹھا۔

''یہی کسر باقی تھی۔ جنگلوں کی خاک ہم نے چھان لی۔ پہاڑوں کی چوٹیاں سر کرلیں۔ فضاؤں میں اڑ کر دیکھ لیا۔ بس ایک سمندر میں ڈوب مرنے کی کسر باقی تھی اور اب پوری ہو جائے گی۔'' اس نے بندرگاہ پر پہنچتے ہی کہا۔

''بولتے رہو۔ بولتے رہو۔ وہاں تو ظاہر ہے، سمندر کے شور میں تمہاری آواز کوئی نہیں سن سکے گا۔'' کیپٹن علی نے لقمہ دیا۔

''جی ہاں! ڈوبنے والوں کی چیخ و پکار پر کوئی دھیان ہی نہیں دیا کرتا۔''

''اتنا ڈرتے کیوں ہو پانی سے۔ روزانہ غسل کرتے ہو۔''

کیپٹن علی نے پھر اسے چڑایا۔

''اجی کون کم بخت ڈرتا ہے۔ مجھے تو سفر کی طوالت سے خوف آ رہا ہے۔''

''اچھا یار ڈرو نہیں۔ تم ہر وقت لائف جیکٹ پہنے رہا کرنا۔'' علی نے اس کے کندھے کو تھپک

کر کہا۔

''جی ہاں! لائف جیکٹ بندھی دیکھ کر تو شارک مچھلیاں مجھے مکروہ سمجھ کر چھوڑ دیا کریں گی اور کھائیں گی نہیں شاید۔''

''اس غلط فہمی میں تو کبھی نہ رہنا۔ تم جیسے تندرست و توانا انسان کا گوشت مچھلیاں بڑی رغبت سے کھاتی ہیں۔''

اس نوک جھونک میں وہ بندرگاہ تک پہنچ گئے تھے۔ ان کا سامان ایک لانچ میں رکھا جا رہا تھا۔ اس لانچ نے انہیں مڈغاسکر کے نزدیک پہنچا دیا جو ان سے کچھ فاصلے پر کھلے سمندر میں لنگر انداز تھا۔

مڈغاسکر پر برطانیہ کی ایک جہاز راں کمپنی کا نشان کھدا ہوا تھا۔ یہ جہاز برطانیہ میں دنیا کے بہترین جہازوں میں شمار ہوتا تھا۔ اپنی مضبوطی اور خوب صورتی کی وجہ سے مڈغاسکر سمندری راستوں سے سفر کرنے والوں کی اولین پسند تھا۔ لیکن اس کا کرایہ اتنا مہنگا تھا کہ عام آدمی تو اس کی طرف دیکھنے کی ہمت بھی نہ کرتا۔ اور دنیا کے امیر ترین تاجر اور روسیاہ ہی اس کے ذریعے سفر کیا کرتے تھے۔ اس جہاز میں انتظامات بھی ان لوگوں کے شایان شان کئے جاتے تھے۔

لانچ جہاز سے ملحقہ ایک کشادہ سیڑھی سے لگ کر رک گئی۔ ان کا سامان جہاز کے مؤدب ملازمین نے اٹھا لیا اور اور اس کشادہ سیڑھی پر قدم دھرتے ہی وہ لوگ جہاز پر چلے گئے۔ ان کے پاس چونکہ درجہ اول کی ٹکٹیں تھیں اس لیے انہیں جہاز کی پہلی ہی منزل پر بڑے آرام دہ اور شان دار کمرے ملے تھے۔ کیپٹن علی نے اپنے لیے دو ملحقہ کمرے بک کروائے تھے جنکے درمیان خصوصی راستہ رکھا گیا تھا کیونکہ ان کمروں کا شمار فیملی میں ہوتا تھا۔ کمروں کے نمبر سات اور آٹھ تھے۔

جہاں ان لوگوں کو کمرے الاٹ ہوئے تھے وہاں دو رویہ کمروں کی قطاریں تھیں۔ درمیان میں ایک شان دار راستہ جہاز کے دوسرے حصوں میں جانے کے لیے بنایا گیا تھا۔ اس راستے پر بڑے قیمتی کارپٹ بچھے ہوئے تھے۔ جہاز میں آنے کے فوراً ہی بعد عامر، ٹیپو اور ولیم کو احساس ہونے لگا تھا کہ وہ دنیا کے کسی خاص جہاز کے مسافر ہیں۔

عامر اور ٹیپو نے ایک کمرے پر قبضہ جما لیا تھا جب کہ علی اور ولیم دوسرے کمرے میں تھے۔ وہ لوگ اپنے نئے ناموں کے ساتھ تاجروں کے روپ میں سفر کر رہے تھے اور ان کے پاسپورٹوں پر بھی ان کے یہی نام اور کوائف درج تھے۔ چاروں اس وقت ایک ہی کمرے میں بیٹھے تھے کمرے گو کہ چھوٹے چھوٹے تھے لیکن ان میں ہر ممکن آسائش کا خیال رکھا گیا تھا۔

جہاز کی روانگی تقریباً دو گھنٹے بعد ہونی تھی۔

''شکر ہے! جہاز تو چلا۔ ورنہ میں تو سمجھا تھا کہ اس کی روانگی بھی اب یہاں سے ایک ماہ بعد ہی ہوگی۔'' عامر منہ بسورتے ہوئے بولا۔

''ایسا بھی ممکن ہے۔ بسا اوقات سمندری طوفانوں کی وجہ سے جہاز مہینوں سمندر کے درمیان بھٹکتا رہتا ہے یا کسی محفوظ جگہ پر لنگر انداز ہو جاتا ہے۔'' ولیم نے بڑے فلسفیانہ انداز سے کہا۔

''چچا کوئی خدا کا خوف کرو۔ کیوں ہمیں مارنے پر تلے ہو''۔ عامر سے رہا نہ گیا۔

''جو حقائق تھے میں نے بیان کر دیے میرے آقا۔'' ولیم نے اسی لہجے میں جواب دیا۔

چاروں قہقہہ مار کر ہنس دیے لیکن پھر جلد ہی سنجیدہ ہو گئے۔ ان کے کمرے کی اطلاعی گھنٹی بجنے لگی تھی۔ کوئی اندر داخل ہونا چاہتا تھا۔

''چلے آیئے!'' علی نے بآواز بلند کہا۔

جواب میں جو شخصیت اندر داخل ہوئی، اس کی طرف دیکھ کر کوئی بھی مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔ اس کا حلیہ ہی کچھ ایسا تھا۔

''میرا نام موسس ڈی فرانس ہے۔ آسانی کے لیے آپ مجھے صرف موس کہہ سکتے ہیں۔ میں آپ کا ہمسایہ ہوں اور آپ کی دوستی کا خواہاں ہوں۔ میرا تعلق فرانس سے ہے۔''

وہ شخص جس کا قد بمشکل پانچ فٹ کا ہوگا اور شکل سے ہی سرکس کا مسخرہ معلوم ہوتا تھا، نے اپنا فلیٹ ہیٹ دونوں ہاتھوں میں تھام کر قریباً جھکتے ہوئے ان سے کہا۔

''خوش آمدید!'' علی نے مسکراتے ہوئے اس کا تعارف اپنے باقی ساتھیوں سے کروا

شروع کیا۔ ''میرا نام عدنان ہے۔ یہ میرا ساتھی فوسٹر ہے۔'' اس نے وسیم کی طرف اشارہ کیا۔ ''وہ ...دنی ہے.....'' اس کی بات ادھوری ہی تھی جب عامر بول پڑا:

''مجھے کاؤنٹ بارلے ڈی ماؤنٹ فوسٹر لینگلنٹ کہتے ہیں۔ میرے آباؤ اجداد بھی فرانس کے رہنے والے تھے۔ میرے والد کے پرنانا کے چچا لوئی ہشتم کے نائٹ تھے۔'' اس کے اپنا تعارف خود ہی کروانا بہتر سمجھا۔

''اوہ.....! آپ تو میرے ہم وطن ہوئے۔'' نووارد نے بڑی گرم جوشی سے عامر سے مصافحہ کیا۔

''اور ہم پیشہ بھی۔ میں بھی سرکس میں جوکر ہوں۔'' عامر نے اس سے بھی زیادہ گرم جوشی کا مظاہرہ کیا۔

ولیم اور ٹیپو کے لیے اپنی ہنسی پر قابو پانا بڑا مشکل ہو رہا تھا۔

''آپ واقعی سچے فرانسیسی ہیں۔ پہلی ہی ملاقات میں بے تکلف ہونے پر اتنی خوشی ہو رہی ہے آپ سے مل کر کہ بیان نہیں کر سکتا۔'' موس نے دانت نکالتے ہوئے کہا۔

''اور مجھے بھی۔ اگر ہم اکٹھے کسی سرکس میں کام کرنے تو.....'' عامر کی بات ادھوری ہی تھی جب علی درمیان میں بول پڑا۔

''مسٹر موس! پلیز برا مت منایئے گا۔ اصل میں میرا دوست فوراً بے تکلف ہو جاتا ہے۔''

علی نے کچھ دیکھ لیا تھا کہ ولیم اور ٹیپو کے لیے اپنی ہنسی پر قابو پانا اب ممکن نہیں رہا۔ اس سے پہلے کہ وہ بے اختیار ہو کر ہنس دیں اس نے خود ہی ان سب کو ہنسنے کا موقع فراہم کر دیا۔

''اچھی عادت ہے۔ اچھی عادت ہے۔ مجھے تو خود ایسے لوگ بہت پسند ہیں۔ میں بھی تکلفات کا عادی نہیں۔'' اس نے بھی خواہ مخواہ دانت نکال دیے۔

''اچھا، مجھے اب اجازت دیجیے۔ باقی لوگوں سے بھی تعارف کرنا ہے۔ میرے لائق کوئی بھی خدمت ہو تو ضرور آگاہ کیجیے۔ جہاز کا سیکنڈ کپتان میرا دوست ہے۔'' اس نے عامر کا گہری نظروں سے جائزہ لیتے ہوئے کہا اور دروازہ کھول کر دوبارہ بڑے احترام سے کورنش بجا لاتے

ہوئے واپس مڑ گیا۔

''تمہاری زبان آخر کبھی کنٹرول میں کیوں نہیں رہتی۔'' اس کے جاتے ہی علی بولا۔

''کمال ہے! میں نے کیا گستاخی کی؟'' عامر نے انجان سا بن کر پوچھا۔

''آخر اتنا لمبا نام بتانے کی کیا تک تھی؟'' علی بولا۔

''کمال ہے! ٹھگنا سا آدمی اپنا اتنا لمبا نام بتا سکتا ہے تو میں 5 فٹ 11 انچ لمبا انسان ا مختصر نام کیوں بتاؤں؟'' عامر بولا۔

اس کی بات پر تینوں بے اختیار ہنس پڑے۔

☆☆☆☆☆

ان کو جہاز میں سفر کرتے آج آٹھواں روز تھا۔

اس دوران موسس ان سے بڑی بے تکلفی سے ملتا رہا اس نے کیپٹن علی اور اس کے ساتھیو کا تعارف جہاز کے نائب کپتان مائیکل سے کروایا تھا۔

مائیکل تھا تو ڈنمارک کا سیکنڈ کپتان۔ لیکن نہ جانے کیوں وہ شکل سے چھٹا ہوا غنڈہ دکھائی د تھا۔ خصوصاً عامر کی نظر میں تو وہ پہلے ہی روز سے کھٹکنے لگا تھا۔ جب بھی اس کی ملاقات جہاز ڈائننگ ہال میں عرشے پر یا کسی اور جگہ ہوتی۔ عامر نے دیکھا موسس اور مائیکل دونوں ہی بڑ گہری نظروں سے ان کا جائزہ لے رہے ہوتے تھے۔

جہاز کا کپتان بڑا ہنس مکھ آدمی تھا اور وہ عموماً مسافروں میں گھل مل کر رہتا لیکن مائیکل جہ بھی باہر نکلتا۔ ایک دو باڈی گارڈ اس کے ساتھ ضرور ہوتے یہ کوئی ایسی غیر معمولی بات بھی نہیں تھی۔ لیکن یہی بات عامر کی نظروں میں کھٹکتی تھی جس کا ذکر وہ آج بھی بڑی شدومد سے کیپٹن سے کر رہا تھا۔

''کیوں خوامخواہ میرا دماغ چاٹ رہے ہو یار!''

کیپٹن علی نے بظاہر اس سے پیچھا چھڑانا چاہا۔

''انکل آپ کو تو خوامخواہ اس بے چارے شک ہو گیا ہے۔'' ٹیپو نے مسکراتے ہوئے کہا۔

عزیز من! میرا شک غلط ہے یا صحیح۔ اس کا اندازہ تو ایک آدھ روز میں ہو ہی جائے گا۔ لیکن میری یہ کوشش ضرور ہے کہ ہمیں سمندری جانوروں کی خوراک نہ بننا پڑے۔ مرنے کے لیے تو وہاں بڈاشا میں بھی بہت سی جگہیں موجود ہوں گی۔'' عامر بولا۔

''میری بات غور سے سن لو۔ اب تم ضرور جاننا ہی چاہتے ہو تو تمہیں بتا دوں۔ عامر کا شک غلط نہیں۔'' علی نے تینوں سے کہا تو ولیم اور ٹیپو بھی چونکے بغیر نہ رہ سکے۔

''مطلب؟'' ولیم بولا۔

''میں نے اپنی آنکھیں بند نہیں رکھیں۔ مجھے بھی ان لوگوں پر شک ہو گیا تھا لیکن میں آج تک یہی سوچتا رہا کہ آخر انہیں ہمارے متعلق معلومات کہاں سے حاصل ہوئیں کیونکہ ہماری روانگی کو بہت خفیہ رکھا گیا تھا اور بہت کم لوگوں کو اس کا علم تھا۔ بہر حال اپنے ملک میں اس غدار کی تلاش شروع ہو چکی ہے جس نے ان کی مدد کی ہے۔'' کیپٹن علی بڑا سنجیدہ نظر آ رہا تھا۔

میں تمہیں پھر بتا دوں کہ ٹانگو کوئی عام قسم کا مجرم نہیں ہے۔ دنیا کا چالاک ترین مجرم ہے۔ اسکے بیشمار ذرائع ہیں۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ تم لوگوں کو ابھی اس بات کا علم ہو کہ انہوں نے ہمیں پہچان لیا ہے۔ لیکن اب چونکہ عامر یہ بات جان ہی چکا ہے تو ایک بات غور سے سن لو اور پلے باندھ لو، اپنی کسی حرکت سے یہ بات ظاہر نہ ہونے دینا کہ ہمیں بھی ان لوگوں کی اصلیت کا علم ہو چکا ہے۔''

علی نے انہیں سمجھایا پھر ان کے درمیان خطرے کی صورت میں ایک دوسرے کو آگاہ کرنے کے لیے چند سگنل کا تعین ہوا اور وہ مطمئن ہو کر اپنے اپنے کمروں میں سو رہے۔

☆☆☆☆☆

اگلے روز شام گئے وہ ایک منصوبے کے مطابق جہاز کے عرشے پر چلے آئے۔ جہاز کے عرشے پر بہت سے مسافر ڈوبتے سورج کا نظارہ کر رہے تھے۔ پھر اندھیرا پھیلنے لگا تو سب ایک ایک کر کے چلے گئے۔ صرف عامر وہیں رہ گیا۔ وہ جہاز کے عرشے کے جنگلے پر جھکا دور سمندر پر نظریں گاڑے کھڑا تھا۔ وہاں اس کے علاوہ مائیکل اور اس کے دو ساتھی بھی موجود تھے۔

پھر مائیکل اور اس کا ایک ساتھی بھی نیچے چلے گئے۔ عامر جان بوجھ کر اسی پوزیشن میں کھڑا رہا۔

اسے اس بات کا احساس بھی نہ ہو سکا کہ کب مائیکل کا یہ ساتھی دبے قدموں چلتا اس کے نزدیک پہنچ چکا ہے۔

''ہیلو سر!'' اس نے عامر کے کندھے کو چھو کر اپنی طرف مخاطب کیا۔ عامر جیسے ہی پلٹا، اسے ملازم کے ہاتھ میں پستول پکڑا ہوا نظر آ گیا جس کے منہ پر سائلنسر لگا ہوا تھا تاکہ فائر کی آواز بھی سنائی نہ دے سکے۔

''اس کی کیا ضرورت تھی۔ لہروں کے شور میں تو کوئی آواز ویسے بھی کم سنائی دیتی ہے۔'' عامر نے پستول پر لگے سائلنسر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

وہ اس اچانک پیش آنے والی صورت حال پر گھبراہٹ کا مظاہرہ کر کے دشمن کو برتری کا موقع نہیں دینا چاہتا تھا اور بظاہر بالکل لاپروا اور مطمئن نظر آ رہا تھا۔

''ہاتھ اوپر اٹھا لو مسٹر! کافی چالاک آدمی دکھائی دیتے ہو۔'' وہ بولا۔

''نہیں، ایسی تو کوئی بات نہیں۔ تمہارا حسن ظن ہے ورنہ اس صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لیے کم از کم میری جیب میں کوئی سبزی کاٹنے والا چاقو ہی موجود ہوتا۔'' عامر بولا۔

''زیادہ باتیں سننے کا میرے پاس وقت نہیں ہے۔ تمہارے پاس دو ہی چوائس ہیں۔ یا تو سمندر میں چھلانگ لگا دو اس طرح ممکن ہے تم زندہ بچ جاؤ۔ ورنہ میں تمہیں گولی مار کر سمندر میں پھینک دوں گا۔ بہرحال تمہیں سمندر میں تو جانا ہی ہے۔ زندہ یا مردہ۔'' اس نے بڑے سفاک لہجے میں کہا۔

دیکھو بھائی صاحب! مجھے مردہ سمندر میں نہ پھینکنا۔ کم از کم میرا مردہ خراب نہ کرنا۔ یوں بھی میں نے زندگی میں کبھی سمندر کی خوراک بننے کی خواہش نہیں کی۔ تم کو شاید کوئی غلط فہمی ہو گئی ہے۔ میں تو سیدھا سادا آدمی ہوں'' عامر نے ایک قدم اس کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

''خبردار! وہیں رک جاؤ ورنہ.....''۔ اس نے پستول فائر کرنے کی پوزیشن میں کر لیا۔

''اچھا یار، غصہ نہ کرو۔ رک جاتا ہوں۔ کم از کم مجھے مارنے سے پہلے یہ تو بتا دو کہ مجھے کر

علم سے اور کیوں مارنا چاہتے ہو؟'' عامر دراصل گفتگو کی طوالت کا کوئی بہانہ ڈھونڈ رہا تھا۔ اسے انگی تھی کہ کیپٹن علی ابھی تک کیوں نہیں یہاں پہنچا۔

زیادہ انجان مت بنو۔ میں تمہیں کیا بے وقوف نظر آتا ہوں۔'' اس نے غصے سے دانت ہتے ہوئے کہا۔

''ارے نہیں بھائی! تم تو شکل سے افلاطون دکھائی دیتے ہو۔ لیکن.....''۔

''خبردار زیادہ چالاک نہ بنا!'' اس نے دوبارہ عامر کو للکارا۔

عامر نے واقعی اس کی طرف چھلانگ لگانے کی پوزیشن ہی بنانی چاہی تھی کہ وہ تاڑ گیا۔ آدمی نی چالاک دکھائی دیتا تھا۔ ایک لمحے کو تو عامر گڑبڑا کر ہی رہ گیا۔

''چلے تھے عظیم ڈاکٹر ٹانگو کو مارنے۔ عظیم اور ناقابل تسخیر ڈاکٹر ٹانگو جو ساری دنیا پر حکومت رے گا۔ تمہاری حیثیت ہی کیا ہے اس کے سامنے۔'' اس نے نفرت سے ہونٹ سکوڑے۔

''اچھا بھائی! صرف یہی بتا دو کہ یہ ڈاکٹر ٹانگو صرف ٹانگوں کا ڈاکٹر ہے؟''

''شٹ اپ!'' وہ چلایا!

''میرا مطلب گھوڑے تانگے نہیں، ٹانگیں تھا.....ٹانگیں''۔ عامر نے چاہا کہ اسے مزید طیش لائے۔ اس طرح وہ کوئی بھی غلط حرکت کر کے عامر کو حملے کا موقع دے سکتا تھا۔

''تمہیں زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں۔ تم نے عظیم ٹانگو کو توہین کی ہے۔'' کہتے ہوئے اس نے امر کی طرف پستول سیدھا کر لیا۔ اس کی انگلی ٹریگر پر جمی ہوئی تھی۔

اس سے پہلے کہ وہ فائر کرتا، اچانک اس کے ہاتھ سے خون کا فوارہ اچھلا اور پستول نکل کر ور جا گرا۔ عامر نے سامنے نظریں دوڑائیں تو اندھیرے میں اسے کیپٹن علی کا ہیولہ دکھائی دیا۔ اس نے لپک کر پستول اٹھا لیا۔ اب علی نزدیک آ چکا تھا اور دونوں کو صاف دکھائی دے رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں بھی ایک سائلنسر لگا ننھا سا پستول موجود تھا۔

''اگر زندہ بچ گئے تو ٹانگو تک یہ اطلاع پہنچا دینا کہ اس کا مقابلہ بھی کیپٹن علی سے ہے۔'' عامر بولا۔

کیپٹن علی اس کے نزدیک پہنچ کر رک گیا۔

''ظاہر ہے ہم تمہیں یہاں عرشے پر اس طرح چیخنے چلانے کا موقع تو دے نہیں سکتے نے بڑی فراخ دلی دکھائی تھی۔ تمہارا مقابلہ کسی کمینے دشمن سے نہیں۔ میں تمہیں اسی طرح سر میں پھینک رہا ہوں۔ اگر بچ جاؤ تو تمہاری قسمت۔''

یہ کہتے ہوئے علی نے جھک کر اسے یوں اٹھایا جیسے کسی پلاسٹک کے انسان کو اٹھایا ہو اور ور پہلوانوں کی طرح سر کے اوپر سے گھما کر سمندر میں پھینک دیا۔

گرنے والے کی چیخ بہت بھیانک تھی۔ دونوں نے اسے ایک آدھ مرتبہ پانی سے ابھر دیکھا پھر وہ سمندر کی خوراک بن گیا۔ جہاز اس سے دور ہی دور ہٹتا چلا گیا۔ عامر نے اس کا پس بھی اس کے پیچھے ہی پھینک دیا۔ علی نے اطمینان سے پستول سے سائلنسر الگ کیا، اسے ا کپڑوں میں چھپایا اور دونوں ایک دوسرے کا ہاتھ تھام کر جہاز کے ہال میں چلے آئے۔

کھانا انہوں نے حسب معمول جہاز کے ڈائننگ ہال ہی میں کھایا تھا۔ ان کے چہرے قطعاً کسی تردد یا پریشانی کا احساس نہیں ہوتا تھا۔ وہ دونوں بالکل نارمل نظر آ رہے تھے۔ ع ہدایات پر عامر نے اس واقعہ کی ٹیپ اور عامر کو بھی کانوں کان خبر نہیں ہونے دی تھی۔

صبح جب وہ چاروں ہلکی ورزش کرنے کے لیے جہاز کے عرشے پر آئے تو وہاں ا ملاقات سب سے پہلے مائیکل سے ہوئی۔ موسس بھی اس کے ساتھ ہی موجود تھا۔

''کیا زمانہ آ گیا ہے صاحب!'' موسس نے چھٹتے ہی عامر سے کہا۔

''خیریت؟'' ولیم نے دریافت کیا۔

''وہ جو میرا ملازم تھا ناں، وہی کم بخت جو میرے ساتھ ساتھ لگا رہتا تھا، وہ کالا سا، لمبا اس کی بجائے مائیکل نے کہنا شروع کیا۔

''ہاں، ہاں۔ مجھے یاد آ گیا۔ وہ عموماً آپ کے ساتھ ہی لگا رہتا تھا بے چارہ۔'' عام لفظوں کو چبا چبا کر کہا۔

''وہ کم بخت کل میرے بریف کیس سے 20 ہزار ڈالر کی رقم لے کر بھاگ گیا۔ نہ

ندر میں کیسے اترا ہوگا۔ زندہ بھی پہنچ سکے گا یا نہیں۔'' مائیکل نے بظاہر لاتعلقی سے کہا۔

''واقعی!'' عامر نے آنکھیں پھاڑتے ہوئے اس سے پوچھا جیسے یہ خبر اس کے لیے بڑی ران کن رہی ہو۔

''بالکل جناب! دس سال پرانا ملازم تھا میرا۔ جانے کیسا زمانہ آ گیا ہے۔ مجھ سے لیتا تو ں شاید اسے آدھی رقم تو دے ہی دیتا۔''

''اوہ بڑا بدقسمت تھا کم بخت۔ واقعی آپ جیسے نیک مالک اسے اب کہاں ملیں گے۔ ساحل ہاں سے کم از کم سو میل دور ہے۔ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ وہ وہاں تک پہنچ سکے۔'' علی نے ان کی لفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا۔

''لالچ بری بلا ہے جناب!'' ولیم بولا۔

''بسا اوقات زیادہ چالاکی بھی لوگوں کو لے ڈوبتی ہے۔'' عامر نے لقمہ دیا۔

مائیکل اور موسس اسے گھور کر رہ گئے۔ زبان سے کچھ نہ کہا۔

''ویسے میرے ذہن میں ایک بات آئی ہے جس نے یہ حرکت کی ہوگی آخر اس نے بھاگنے لی بھی تو کوئی نہ کوئی ترکیب سوچ رکھی ہوگی۔'' عامر نے دوبارہ ان کی طرف معنی خیز نظروں سے یکھتے ہوئے کہا۔

''اوہ جہنم میں جائے سب کچھ۔ ایسا تو زندگی میں ہوتا ہی رہتا ہے۔'' موسس نے کہا۔

''میں تو آپ لوگوں کو یہ اطلاع دینا بھول ہی گیا۔ آج رات تک ہم لوگ پورٹ سعید پہنچ جائیں گے جہاں دو روز قیام کرنا ہوگا۔ دراصل جہاز میں ایک معمولی سا نقص پیدا ہو گیا ہے جس کی جہ سے ہمیں دو دن تک وہاں ٹھہرنا ہوگا۔'' یہ کہہ مائیکل انہیں سلام کر کے واپس چلا گیا۔

برے پھنسے

جہاز پورٹ سعید پہنچ کر لنگر انداز ہو گیا۔

جہاز راں کمپنی کی طرف سے مسافروں کو ایک اعلیٰ درجے کے ہوٹل میں ٹھہرانے کا بندوبست کیا گیا تھا۔ ان چاروں کو ایک فیملی روم الاٹ کر دیا گیا۔ یہ بڑا شان دار سوٹ تھا اور ایک مکمل فیملی کے لیے بنایا گیا تھا۔ رات کو ہوٹل میں پہنچے تھے۔ ابھی انہوں نے اپنا معمولی سا سامان جو وہ اپنے ساتھ یہاں لے آئے تھے۔ کھول کر کپڑے تبدیل ہی کئے تھے جب دروازے پر دستک ہوئی۔ چاروں سنبھل کر بیٹھ گئے۔

ایک مؤدب بیرا ہاتھوں میں کھانے کی ٹرے تھامے اندر داخل ہوا۔ اس نے اپنی طرف سے آداب بجالاتے ہوئے کھانا میز پر سجا دیا۔ جب وہ کھانا سجا کر واپس مڑنے لگا تو کیپٹن علی نے اسے مخاطب کیا۔

"ٹھہرو!"

"یس سر!" اس نے بڑے آداب سے کہا۔

"کیا اس ہوٹل میں کھانا مسافروں کے کمرے میں پہنچانے کا رواج ہے؟" اس نے بیرے سے دریافت کیا۔

"نو سر! دراصل منیجر صاحب نے سمجھا آپ لوگ شاید تھکے ہوئے ہوں اور باہر آنا پسند نہ کریں۔" بیرے کے چہرے پر گھبراہٹ کے آثار نمایاں تھے۔

"اپنے منیجر صاحب کا شکریہ ادا کرنا لیکن انہیں بتانا کہ ہم اتنی جلدی تھکنے والے نہیں ہیں۔" علی نے بڑے معنی خیز لہجے میں کہا۔

"او۔ کے سر!" کہہ کر بیرا چلا گیا۔

"اللہ بھلا کرے! کتنے اچھے لوگ ہیں۔ مسافروں کی صحت اور آرام کا کتنا خیال ہے انہیں۔" عامر نے کھانے کی مختلف ڈشوں پر نظریں دوڑاتے ہوئے کہا۔

بسم اللہ کہہ کر اس نے کھانے کی طرف قدم بڑھائے۔

"ٹھہرو!" علی نے اسے رکنے کا اشارہ کیا۔

"اوہ!" میں بھی کتنا بے وقوف ہوں۔ اکیلا ہی....." عامر نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

پھر وہ سب حیرانگی سے علی کی طرف دیکھنے لگے۔ اس نے کمرے کا دروازہ لاک کرنے کے بعد اپنے بریف کیس کو کھولا۔ اس میں سے ایک تھرمامیٹر قسم کی چیز نکالی جس کے ایک سرے پر ڈراپر فٹ تھا۔ پھر سالن کے ایک ڈونگے سے سالن نکال کر ایک پلیٹ میں انڈیلا۔

اس کے بعد علی نے ایک چھوٹی سی شیشی میں سے ایک محلول سا نکال کر اس میں شامل کیا اور اس ڈراپر میں سالن ڈالا تو تھرمامیٹر پر بنا سرخ نشان حرکت کرنے لگا۔ پھر وہ درمیان میں آ کر رک گیا۔ علی نے اونچا کر کے اسے اپنی آنکھوں کے سامنے کیا اور اس پر لگا نمبر پڑھنے لگا۔

"زہر!" اس کے منہ سے نکلا اور تینوں چونک اٹھے۔

"مم مطلب!" عامر نے اداکاری شروع کی۔

"لیکن اس سے کوئی مرے گا نہیں۔ صرف گہری بیہوشی طاری ہوگی۔" علی نے کہتے ہوئے وہ ڈراپر کمرے کے باتھ روم میں دھویا اور دونوں چیزیں بریف کیس میں بند کر کے ان کی طرف مخاطب ہوا۔

''اب آپ نے کھانا کھا کے بے ہوش ہونا ہے یا اس کے بغیر.....''

''پہلے تو کھانا کھا ہی لینے دیجئے۔ جب بے ہوش ہی ہونا ہے تو کچھ کھا لیا جائے۔ خالی پیٹ کی بے ہوشی سے صحت کو نقصان پہنچنے کا خطرہ رہتا ہے۔'' عامر نے ایک پلیٹ میں سالن انڈیلتے ہوئے کہا۔

علی نے مسکراتے ہوئے اس کی گردن میں دھول جما دی۔ اس کے بعد انہوں نے تمام پلیٹوں کو سالن سے بھر دیا۔ پھر سالن اور کھانے پینے کی تمام اشیاء فلش میں بہا دیں۔ یوں لگتا تھا جیسے ان لوگوں نے ڈٹ کر کھانا کھایا ہو۔ اس کے بعد وہ سب باری باری مختلف انداز سے بظاہر بے ہوش ہو کر گر پڑے۔ ان کے گرنے کا انداز بالکل قدرتی تھا۔ عامر نے چاہا تھا کہ بستر پر گرے لیکن علی نے اسے بستر سے فرش پر گرا دیا تھا۔

اس پوزیشن میں انہیں بیس منٹ ہو گئے تھے۔ لیکن ابھی تک دوسری طرف کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔

''میری تو کمر ٹوٹنے لگی ہے۔'' عامر بولے بغیر نہ رہ سکا۔

''ٹوٹنے دو۔'' علی نے اسی پوزیشن میں لیٹے لیٹے جواب دیا۔

''کمال ہے! اگر بے ہوش ہی ہونا تھا تو پلنگ اور صوفے پر ہونے میں کیا حرج ہے۔'' عامر نے سرگوشی کی۔

''تمہاری زبان بند نہیں رہ سکتی۔'' علی بولا

''کھجلی ہونے لگتی ہے۔''

اس سے پہلے کہ وہ مزید کچھ بولے علی نے اس کا کندھا دبا دیا۔ کوئی باہر سے دروازہ کھٹکھٹا رہا تھا۔ شاید وہ لوگ یقین کرنا چاہتے تھے کہ اندر کام بخوبی انجام پا چکا ہے یا نہیں۔ ان کی طرف سے کوئی جواب نہ آنے پر انہوں نے کمرے کے دروازے پر باہر سے ایک چابی اندر گھومتی دیکھ لی۔ پھر ایک شخص جس نے ہوٹل کے ملازمین ہی کی یونیفارم پہن رکھی تھی۔ اندر چلا آیا۔ اس نے ایک نظر بے ہوش مسافروں پر ڈالی، پھر دروازہ بند کر دیا۔

جیسے ہی دروازہ بند کر کے وہ واپس پلٹا، اچانک منہ کے بل زمین پر آ رہا۔ ٹیپو نے لیٹے لیٹے اس کی ٹانگوں میں ٹانگ پھنسا دی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ سنبھل کر کھڑا ہو، علی نے ہوش میں آتے ہی اس کی گردن پر ایسی جگہ ہاتھ رکھ دیا کہ بے چارے کے منہ سے آواز بھی نہ نکل سکے۔ اس کے ساتھ ہی اس نے پستول نکال کر اس کی کنپٹی سے لگا دیا۔

''خبردار! آواز نہ نکالنا، ورنہ.....'' اس کا لہجہ ایسا تھا کہ دلیم تو سہم کر ہی رہ گیا۔ علی کی آنکھوں سے خون برس رہا تھا۔ اس نے علی کا یہ روپ پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔

''چپ چاپ ہمارے احکامات کی تعمیل کرتے رہو ورنہ کتے کی موت مارے جاؤ گے۔'' اس نے مغلوب کو حکم دیا۔

''اجازت ہو تو میں ہوش میں آ جاؤں۔'' عامر بولا۔ ''اب تو پسلیاں بھی درد کرنے لگی ہیں۔''

''تم تو بے ہوش ہی رہو۔'' علی بولا۔

''ٹھیک ہے۔ مجھے صبح سے پہلے ہوش میں نہ لائیے۔'' عامر نے اٹھ کر پلنگ پر لیٹتے ہوئے کہا۔

مغلوب بڑی حیرانگی اور خوف سے ان لوگوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس نے آج تک ایسے اداکار اور لاپروا مسافر نہیں دیکھے تھے۔

''سو جاؤ! یہاں ٹھنڈا پانی بکثرت مل جاتا ہے۔'' اس نے عامر کو جواب دیا۔ پھر مغلوب کی طرف متوجہ ہوا۔

''میں تمہارے متعلق کچھ نہیں جاننا چاہتا۔ تم نے محض چند سکوں کیلئے یہ کام کیا ہے۔ صرف میرے سوالات کے ٹھیک ٹھیک جواب دو ورنہ تم نے دیکھ ہی لیا ہے کہ ہم لوگ آسانی سے مرنے والے نہیں۔ لیکن تمہیں آسانی سے مار دیں گے اور کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہو گی۔'' علی نے اس کی گردن پر گرفت ذرا سخت کی اور وہ گھبرا گیا۔

''جہ..... جہ..... جناب! خدا کیلئے مجھے مت ماریئے۔ میں سب کچھ بتا دوں گا۔'' اس نے

گھگیاتے ہوئے کہا۔

''ہمیں بے ہوش پانے کے بعد تم نے کیا کرنا تھا؟''

''فون کر کے اپنے ساتھی کو بلانا تھا اور آپ لوگوں کو سٹریچر پر ڈال کر باری باری نیچے جانا تھا۔''

''لیکن اس طرح تو ہمارے دیکھ لئے جانے کا خطرہ تھا۔'' علی بولا۔

''اس کا بندوبست کر لیا گیا ہے۔ ایک ہنگامی راستہ موجود ہے۔'' اس نے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے۔ اپنے ساتھی کو فون پر بلاؤ۔ اگر کوئی چالاکی دکھائی تو یاد رکھنا.....'' علی اس کی طرف پستول تان لیا اور سب اپنی اپنی پوزیشن پر واپس چلے گئے۔ وہ شخص لڑکھڑاتا ہوا فون کی طرف بڑھا۔

ابھی اس کا ہاتھ بمشکل فون تک پہنچا ہی تھا جب دروازہ اچانک کھلا اور بند ہو گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ معاملے کی نزاکت کو سمجھیں انہوں نے دیکھا کہ ایک زہر آلود خنجر اس کے پہلو میں پیوست ہے۔ وہ شخص لڑکھڑا کر گرا۔ بے چارے کو منہ سے آواز نکالنے کی مہلت بھی نہ ملی۔ بالکل اسی انداز میں بوغا کی موت واقع ہوئی تھی۔

''جلدی جلدی اپنے اپنے بریف کیس اٹھاؤ۔ فوراً یہاں سے نکلنا ہے۔'' علی نے کہا اور دروازہ کھول کر باہر نکلا۔

باہر راہداری سنسان پڑی تھی۔ اس نے ایک آدھ منٹ تک اردگرد کے ماحول کا جائزہ لیا پھر واپس آ گیا۔ ان کو ہوٹل کے گراؤنڈ فلور پر کمرہ الاٹ ہوا تھا۔ علی کے ساتھیوں نے تیاری اثناء میں پھرتی سے مکمل کر لی تھی۔

علی نے کمرے کا دروازہ لاک کر کے اس کے آگے صوفہ کر دیا اور وہ چاروں دروازے بجائے ایک ایک کر کے اپنے بریف کیس سمیت کھڑکی کے راستے باہر کودنے لگے۔ انہوں ہوٹل کے لان میں چھلانگیں لگائی تھیں سب سے آخر میں علی باہر نکلا تھا۔ اس نے دروازے ساتھ دھینگا مشتی کی آوازیں سن لی تھیں اور جیسے ہی وہ لوگ نیچے پہنچے ہوٹل پولیس کاروں

مخصوص سائرنوں کی آوازوں سے گونجنے لگا۔

تینوں علی کے تعاقب میں ایک اندھیرے راستے سے باہر آ گئے تھے۔ اب ایک قدرے محفوظ جگہ کھڑے تھے۔ مسلسل بھاگ دوڑ سے اب وہ ہانپنے لگے تھے لیکن کیپٹن علی بالکل پہلے کی طرح تازہ دم نظر آ رہا تھا۔

''جان بچی سو لاکھوں پائے۔'' عامر نے ایک قدرے محفوظ جگہ پہنچ کر لمبے لمبے سانس لیتے ہوئے کہا۔

''لوٹ کے بدھو گھر کو آئے۔'' ٹیپو نے جواب دیا۔ چاروں بے ساختہ مسکرا دیے۔

☆☆☆☆☆

چاروں اب اندازے سے شہر سے باہر جانے والے راستے پر سفر کر رہے تھے۔ کیپٹن علی یہاں پہلے بھی متعدد بار آ چکا تھا۔ سڑک کے کنارے ایک چھوٹے سے ریستوران سے اس نے اپنے ایک دوست کرنل رفیق کو فون کیا جو پورٹ سعید کا انٹیلی جنس چیف تھا۔

کیپٹن علی کی طرف سے آدھی رات کو ہونے والی اس فون کال نے کرنل رفیق کو حیران ہی کر دیا۔ اسے خوشی بھی تھی اور حیرانی بھی۔

''تم کہاں سے ٹپک پڑے اس وقت؟'' اس نے علی سے بے تکلفی سے پوچھا۔

''ابھی میں کچھ بتانے کی پوزیشن میں نہیں۔ تم فی الحال ہمیں یہاں سے لے جاؤ۔'' علی نے اسے اپنی منزل بتا کر فون بند کر دیا۔

قریباً پانچ منٹ بعد ہی وہ چاروں مقامی پولیس کی ایک آرام دہ کار میں سفر کر رہے تھے۔

''کمال ہے یار! نہ آنے کی خبر نہ جانے کی خبر۔ اتنی مدت بعد ملے بھی تو یوں اچانک اور.....'' کرنل رفیق نے اس سے بغل گیر ہوتے ہوئے کہا۔

''بس یوں سمجھو کہ ہماری ملاقات بھی ایک حادثہ ہی ہے۔'' علی نے جواب دیا۔

''تمہاری پہیلیاں بجھوانے کی عادت نہ گئی۔'' کرنل رفیق نے کار ڈرائیو کرتے ہوتے کہا۔

''کرنل! ہم ٹانگو کے تعاقب میں ہیں اور وہ یہاں ہمارے تعاقب میں۔ بس یہی سمجھ لو۔''

''کمال ہے! ٹانگو کہاں سے ٹپک پڑا۔ وہ تو آخری اطلاعات کے مطابق مُداشا کی طرف نکل گیا تھا۔'' کرنل رفیق نے چونک کر کہا۔

''یہی تو اس کم بخت کی خوبی ہے کہ وہ ہر جگہ اپنے ہونے اور نہ ہونے کا ثبوت دیتا رہتا ہے۔''

علی نے اسے مختصراً تمام واقعات سے آگاہ کرتے ہوئے کہا۔

''بہت اچھا کیا۔ تم نے تو ہماری مشکل حل کر دی۔ اس ہوٹل پر ہماری نظریں ہیں لیکن ابھی تک کوئی کلو ہاتھ نہیں آ رہا تھا۔ چلو، اب ذرا ان کی بھی خبر لے لیں گے۔'' کرنل رفیق نے ہنستے ہوئے کہا۔

کار ایک شان دار عمارت کے نزدیک رک گئی۔ ان کے لیے کھانا یہاں تیار تھا اور ایک مودب بیرا میز پر سجا رہا تھا۔

''خدا کے لیے یہاں وہ کام نہ شروع کر دیں ورنہ.....''۔ عامر نے کہا اور سب کھلکھلا کر ہنس دیے۔

☆☆☆☆☆

صبح دیر تک وہ لوگ گھوڑے بیچ کر سوتے رہے۔ کرنل رفیق تو انہیں مہمان رکھنے پر تلا ہوا تھا لیکن معاملے کی نزاکت کا احساس کرتے ہوئے اس نے انہیں بادلِ نخواستہ جانے کی اجازت دے دی۔ لیکن یہ وعدہ لے لیا تھا کہ مشن کے خاتمے پر وہ کم از کم تین روز اس کے مہمان رہیں گے۔ وہ لوگ ٹانگو کی سرگرمیوں سے عاجز آ چکے تھے اور علی اب ان سب کی امید بن کر جا رہا تھا۔

علی نے اس مرتبہ ہوائی جہاز سے سفر کرنا مناسب سمجھا تھا۔ ان کے لیے رات کی فلائٹ سے سیٹیں بک ہو چکی تھیں۔ رات کو ہوائی اڈے پر وہ عام مسافروں کی طرح ٹیکسی سے پہنچے تھے۔ علی کوئی خطرہ مول لینا نہیں چاہتا تھا جہاز اور جب آٹھ گھنٹے کی اڑان کے بعد وہ لوگ مُداشا پہنچے تو یہاں صبح ہو چکی تھی۔

کیپٹن علی کی ہدایت کے مطابق یہاں کوئی بھی انہیں لینے نہیں آیا تھا۔ اس نے ہوائی اڈے

پر ہی ایک لاکر میں اپنا سامان رکھوا دیا تھا۔ وہ لوگ مُداشا کے دارالحکومت ''لوکاشا'' میں موجود تھے اور ایک ٹیکسی کے ذریعے کسی ہوٹل کی طرف جا رہے تھے۔

''عجیب بات ہے! کیا ہم یہاں بھیک مانگیں گے۔ سامان تو سارا آپ نے وہاں رکھوا دیا۔ یہ ایک بیگ میں معمولی سے کپڑے، کوئی شریف ہوٹل والا تو ہمیں ٹھہرانے سے رہا۔'' عامر نے جھلتے ہی کہا۔

''تمہارے لیے میں نے سڑک کے کنارے ایک درخت کی چھاؤں تلے سونے کا بندوبست کر لیا ہے۔'' علی نے جو ٹیکسی کی اگلی سیٹ پر بیٹھا تھا، اطمینان سے جواب دیا۔

''وہ تو ٹھیک ہے، لیکن ان بے چاروں نے کوئی گناہ نہیں کیا۔'' اس نے ولیم اور ٹیپو کی طرف اشارہ کیا۔

''ان کا بھی اللہ مالک ہے۔'' علی نے بڑی قلندرانہ شان سے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے۔ ہم یہ بیگ بھی یہاں رکھ دیتے ہیں۔ اس کا بھی اللہ مالک ہے۔'' عامر بولا۔

''یار، تم افریقہ پہنچ کر بھی خاموش نہیں رہ سکتے''۔ علی نے اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

وہ لوگ ایک صحرا میں بنی سڑک پر سفر کر رہے تھے۔ یہاں سے ہوٹل کا فاصلہ کم از کم دس میل تھا۔ ابھی وہ پانچ چھ میل ہی چلے تھے جب دو ٹرکوں نے آپس میں دھینگا مشتی شروع کر دی۔ دونوں ٹرک ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی دوڑ میں گلے ہوئے تھے۔ ٹیکسی ڈرائیور مقامی زبان میں منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑاتا ہوا ہارن بجاتا چلا جا رہا تھا۔ اب سڑک کے دونوں اطراف مصنوعی جنگل کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ ایک موڑ پر اچانک دونوں ٹرک ان کے سامنے آ گئے۔ ڈرائیور اگر پوری قوت سے بریک نہ لگاتا تو ٹرکوں سے جا ٹکراتا۔ ٹرکوں نے سڑک بلاک کر دی تھی۔ اچانک ان میں سے مسلح لوگ باہر نکل آئے۔ انہوں نے ٹیکسی کو گھیرے میں لے لیا۔

عامر نے دیکھا اگلی سیٹ خالی تھی اور کیپٹن علی وہاں سے غائب تھا۔ معلوم نہیں ہوتا تھا اسے زمین کھا گئی یا آسمان نے نگل لیا۔

دھمکی اور دھماکہ

چشم زدن میں ان لوگوں نے ٹیکسی کو گھیرے میں لے لیا۔ ''باہر نکلو۔'' ایک شخص نے چلا کر حکم دیا۔

وہ سب ایک ایک کر کے باہر آ گئے ٹیکسی ڈرائیور کی حالت غیر ہو رہی تھی۔ خوف سے اس کی آنکھیں پھٹی جا رہی تھیں۔ اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ کس مصیبت میں پھنس گیا ہے۔

''وہ کہاں ہے؟'' اسی آواز نے چلا کر سب کو مخاطب کیا۔ اس مرتبہ عامر نے غور سے مخاطب کی شکل دیکھی۔ وہ کم از کم چھ فٹ لمبا سیاہ فام تھا اور شکل ہی سے کوئی چھٹا ہوا بدمعاش دکھائی دیتا تھا۔

''کون کہاں ہے؟'' عامر نے سمجھتے ہوئے نا سمجھی کا انداز اپنایا۔

''تمہارا ساتھی۔'' اس مرتبہ ایک گورے نے جواب دیا۔ شاید یہ ان میں سے واحد گورا ورنہ سب کالے اور مقامی باشندے معلوم ہوتے تھے۔

''کون سا ساتھی؟ کس کا ساتھی؟'' عامر نے اسے چڑاتے ہوئے کہا۔

''تمہارا!'' وہی گورا دھاڑا!''

''اپنا گلا خوامخواہ خراب نہ کرو۔ تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ ہم تین ہی تھے۔ اب بھی تین ہی ہیں اور سب سے بڑی بات کہ ہمارے پاس تو واپسی کا کرایہ بھی نہیں ہے۔ اس لیے تمہیں ہم غریبوں سے کچھ نہیں موصول ہوگا۔'' عامر کی زبان قینچی کی طرح چل رہی تھی۔ اس نے ماحول کا گویا ذرا برابر اثر قبول نہیں کیا تھا۔

اس کی یہی عادت عموماً دلیم کا حوصلہ بھی بڑھائے رکھتی تھی ٹیپو کی بات البتہ اور تھی۔ وہ چونکہ علی اور عامر ہی کا ساتھی تھا اس لیے اس نے بھی حالات سے پریشان ہونا نہیں سیکھا تھا۔

''جہاں تمہیں جانا ہے وہاں کرایہ نہیں دیا جاتا بلکہ جان کا نذرانہ پیش کرنا پڑتا ہے۔'' وہی انگریز بولا۔

''ہم بے چاروں کو مار کر تمہیں کیا ملے گا۔ ہم تو پہلے ہی.....'' اس کی بات نامکمل ہی رہی۔ کیونکہ لمبے تڑنگے سیاہ فام نے ڈانٹ کر اسے خاموش رہنے کا حکم دیا تھا۔

وہ آپس میں کچھ کھسر پھسر کرنے لگے۔ یہ سیاہ فام اپنی گول گول آنکھوں سے خاصا چالاک دکھائی دیتا تھا۔ اس نے غالباً ان لوگوں کو سمجھایا تھا کہ اس طرح عامر باتوں میں الجھا کر ان کا وقت ضائع کرنا چاہتا ہے۔

''چلو، سامنے والے ٹرک میں بیٹھو۔'' اس نے اپنی بات کے خاتمے پر انہیں حکم دیا۔

یہ ایک فوجی قسم کا ٹرک تھا جسے ترپالیں ڈال کر ڈھانپا گیا تھا۔ اندر بھی ٹرک کے پچھلے حصے میں جہاں انہیں بیٹھنے کا حکم ملا تھا، دو مسلح آدمی موجود تھے۔

''آخر تم لوگ ہمیں کہاں لے جا رہے ہو۔ ہمارے پاس کوئی قارون کا خزانہ نہیں۔ تم نے جو کچھ لینا ہے وہ ہم سے لے لو اور ہمیں جانے دو۔'' عامر نے اندر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''تم بہت باتیں کرتے ہو۔'' سیاہ فام نے اسے گھورا۔

''اچھا کم از کم اس بے چارے کو تو جانے دو۔ اس کا کیا گناہ ہے۔'' عامر نے خوف زدہ ٹیکسی ڈرائیور کی طرف اشارہ کیا۔

''اوہ! واقعی اس کا تو ہمیں خیال بھی نہیں رہا۔ یہ بے چارہ تو واقعی بے گناہ ہے۔'' سیاہ فام

نے بڑے سفاک لہجے میں جواب دیا۔

''جاؤ۔تم آزاد ہو۔''اس نے دوبارہ ٹیکسی ڈرائیور کی طرف اشارہ کیا۔

ٹیکسی ڈرائیور سہمی ہوئی نظروں سے کبھی ان کی اور کبھی اپنی ٹیکسی کی طرف دیکھ رہا تھا۔

''جاؤ،نکل جاؤ۔بھاگ جاؤ۔''اسی سیاہ فام نے کچھ ایسے لہجے میں کہا کہ عامر کو اپنی ریڑھ کی ہڈی میں ایک سنسناہٹ سی دوڑتی محسوس ہونے لگی۔اس کے اندازے کے عین مطابق جیسے ہی بدقسمت ٹیکسی ڈرائیور ٹرک سے نیچے اتر کر دو چار قدم چلا،سیاہ فام بدمعاش نے اپنی گن سیدھی کی اور اس پر گولیوں کا مینہ برسا دیا۔

بے بسی سے عامر اور ٹیپو اپنے ہونٹ کاٹ کر رہ گئے ان کی آنکھوں کے سامنے اس درندگی اور وحشت کا مظاہرہ ہوا تھا اور وہ کچھ کرنے سے لاچار تھے۔دل کڑا کر کے انہوں نے اپنے جذبات پر قابو رکھا۔عامر اس مرحلے پر کیس خراب کر کے باقی لوگوں کی جان سے بھی ہاتھ دھونا نہیں چاہتا تھا۔

''کسی اور کو تو جانے کی جلدی نہیں۔''اس سیاہ فام نے قہقہہ بلند کیا۔اس کے ساتھیوں نے اس کے ساتھ ہی زوردار قہقہے لگائے تھے۔یوں دکھائی دیتا تھا جیسے یہ لوگ اس درندگی کے عادی رہے ہوں۔

''تم بہت بری موت مرو گے۔''عامر نے دانت پیستے ہوئے اسے کہا۔ٹیپو نے آج تک عامر کو اس لہجے میں بولتے نہیں سنا تھا۔

''اچھا نجومی صاحب!اطلاع کا شکریہ۔اپنے بارے میں تمہارے کیا خیال ہیں۔''وہی سیاہ فام بولا اور سب قہقہے لگا کر ہنس دیے۔

عامر اور اس کے ساتھیوں نے نفرت سے اپنے منہ دوسری طرف پھیر لیے۔ٹرک بڑی تیز رفتاری سے سفر کر رہا تھا۔کبھی کبھی انہیں فضا میں کوئی ہیلی کاپٹر اڑنے کی آواز سنائی دے جاتی لیکن اندر موجود لوگوں پر اس کا کوئی اثر نہ ہوتا۔شاید یہ یہاں معمول کی بات ہو۔وہ لوگ ا سڑک سے اتر کر صحرا میں سفر کرنے لگے تھے۔ٹرک کے اندر بیٹھے عامر نے اندازہ لگایا کہ وہ

میں قریباً آٹھ دس میل تک آئے تھے جب ٹرک رک گیا۔انہیں باہر نکلنے کا حکم دیا گیا۔

دور دور تک ریگستان میں کسی ذی ہوش کا نام ونشان دکھائی نہ دیتا تھا۔صرف ایک قدیم عمارت ان کو ضرور نظر آئی جس کا فاصلہ یہاں سے بمشکل پندرہ بیس گز رہا ہوگا۔صحرا میں یہ عمارت خاصی قدیم دکھائی دے رہی تھی۔شاید کسی زمانے میں یہ کوئی قلعہ رہا ہو کیونکہ اس کے در و دیوار سے یہی دکھائی پڑتا تھا کہ کوئی تاریخی عمارت ہے۔

مسلح آدمیوں کی معیت میں وہ عمارت کے اندر داخل ہو گئے۔پھر انہیں ایک زمین دوز تہ خانے میں پہنچا دیا گیا۔دروازہ ان کے عقب میں بند ہو گیا۔اس صحرا میں اتنا جدید کمرہ دیکھ کر وہ حیران ہی تو رہ گئے۔کمرہ ٹھنڈا تھا۔وہاں بجلی موجود تھی اور ڈرائنگ روم نظر آ رہا تھا۔

تینوں آرام دہ کرسیوں پر ڈھیر ہو گئے۔ڈرائیور کی موت کا اثر انہوں نے کچھ زیادہ ہی قبول کر لیا تھا اور عامر نہیں چاہتا تھا کہ وہ منہ لٹکائے بیٹھے رہیں۔

''شاید ان لوگوں نے ہمیں گناہ معاف کروانے کا موقع دیا ہے۔میرے خیال سے یہ وقت ضائع کرنا مناسب نہیں۔''عامر نے کچھ اس انداز سے کہا کہ دونوں مسکرا دیے۔

اس کے ساتھ ہی ٹیپو اور وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔اس نے ٹیپو کو خاص اشارہ کیا تھا۔ٹیپو اس کا مطلب سمجھ کر کمرے کی دیوار کا ٹھوک بجا کر جائزہ لینے لگا لیکن انہیں یہاں سے فرار کا کوئی راستہ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔دونوں مایوس ہو کر بیٹھ رہے۔اس طرح بیٹھے انہیں قریباً ایک گھنٹہ ہو چلا تھا۔اس دوران عامر اور ٹیپو تو باقاعدہ سو کر جاگ چکے تھے لیکن ولیم کی آنکھوں سے نیند غائب تھی۔اچانک وہی دروازہ دوبارہ کھلا اور ایک نقاب پوش خالی ہاتھ اندر داخل ہوا۔اس کے پیچھے چار مسلح گارڈ بھی موجود تھے۔

''خوش آمدید دوستو!امید ہے جگہ تمہیں پسند آئی ہوگی۔عظیم ٹانگو کی خواہش ہے کہ اس کے مہمانوں کو آرام سے رکھا جائے۔تمہیں اب زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑے گا۔جلد ہی تمہارا گورو کیپٹن علی بھی یہاں پہنچنے والا ہے جس کے بعد تم سب کو عظیم ٹانگو کی خدمت میں پیش کی جائے گا۔عظیم ٹانگو کی خواہش ہے کہ تمہیں زندہ پیش کیا جائے۔تم بہت خوش قسمت ہو۔عظیم ٹانگو تمہیں اپنے ہاتھ

سے گولی مارے گا۔'' اس کے ساتھ ہی اس کا قہقہہ بلند ہوا۔

''بس یہی سوچ سوچ کر خوش ہوتے رہو''۔ عامر بولا۔

''تم سے ملکر تو عظیم ٹانگو کو بہت خوشی ہوگی کیونکہ تم اچھے خاصے مسخرے بھی ہو۔'' وہی نقاب پوش زور سے قہقہہ لگا کر ہنسا۔

''ہنس لو۔ آخری مرتبہ دل کھول کر ہنس لو۔ اس کے بعد تو رونا ہی رونا ہے۔ چند منٹ بعد تمہاری موت کا فرشتہ بن کر کیپٹن علی یہاں آئے گا۔'' عامر نے یہ بات اتنے اعتماد سے کہی تھی کہ ٹیپو اور ولیم چونکے بغیر نہ رہ سکے۔

دونوں کو نوک جھونک جاری تھی کہ اچانک کمرے کی لائٹ آف ہوگئی۔ اس کے ساتھ ہی عامر، ٹیپو اور ولیم نے اندازے سے مختلف اطراف میں چھلانگیں لگا دیں۔ پھر فضا فائرنگ کی آواز سے کانپنے لگی۔ تینوں کمرے کے محفوظ کونوں میں چھپے تھے۔ ٹیپو کسی طرح رینگتا ہوا اندازے سے نقاب پوش تک پہنچ گیا تھا۔ اس نے نقاب پوش کی ٹانگ پکڑ کر کھینچ لی جو اپنے ساتھیوں کو زور زور سے گالیاں دے رہا تھا۔ نقاب پوش منہ کے بل زمین پر گرا۔

وہ طاقت میں ممکن ہے ٹیپو سے زیادہ ہو۔ لیکن ٹیپو نے اس کی دونوں کنپٹیوں پر کچھ مخصوص ضربیں لگائیں اور وہ لمبے لمبے سانس لینے لگا۔ اچانک کمرے میں کسی روشندان سے ٹارچ روشنی آئی اور اس سے پہلے کہ وہاں موجود مسلح پہرے دار سنبھلیں، چاروں پل بھر میں ڈھیر ہوگئے۔ اب باہر سے فائرنگ کی آوازیں کم ہوتے ہوتے ختم ہوگئیں۔ اس کے ساتھ ہی کمرہ روشن ہوگیا۔

سامنے دروازے سے مڈاشا کی فوج کے جوان اندر داخل ہو رہے تھے۔ ان کے عقب میں کیپٹن علی اور جنرل زاہدان بھی اندر داخل ہوئے۔

''زحمت اٹھانے پر معذرت!'' جنرل زاہدان بولے۔

''شکریہ جناب! لیکن یہ ہمارے لیے معمول کی بات ہے۔'' عامر نے جواب دیا۔

علی نے انہیں بتایا کہ وہ ٹیکسی سے نکل کر قریبی فوجی اڈے تک پہنچا۔ وہاں سے محکمہ صحت کے ایک ہیلی کاپٹر کے ذریعے ان لوگوں نے ٹرک کا تعاقب کیا تھا۔ اس خدشے سے کہ کہیں انہیں

نہ ہو جائے، فوج کے جوانوں کو بھی ایک دوائیاں چھڑکنے والی پرائیویٹ کمپنی کے ہیلی
ں میں یہاں لایا گیا اور اس لیے انہیں کچھ دیر بھی ہوگئی۔

میں چاہتا تو یہ کھیل راستے ہی میں ختم ہو جاتا لیکن ایک ایک کر کے اگر ڈاکٹر ٹانگو کے اڈوں کا
ھی ہو جائے تو کیا مضائقہ ہے۔'' علی نے آخر میں کہا۔

''اس طرح کہیں ہم قربانی کے بکروں کا صفایا بھی نہ ہو جائے۔'' عامر بولے بغیر کہاں

اس کی بات پر سب ہی قہقہے لگا کر ہنسنے لگے۔

اس مقابلے میں ٹانگو کے پندرہ ساتھی مارے گئے اور چھ گرفتار ہوئے تھے۔ ان میں وہ سیاہ
ں موجود تھا۔ عامر اس کی شکل پر نظر پڑتے ہی اس کے نزدیک جا کر رکا اور بولا۔ ''میں نے کہا
تمہارا انجام بہت برا ہوگا۔ تم نے دیکھ لیا مجھے علم نجوم پر کتنا عبور حاصل ہے۔''

سیاہ فام نے اس کا جواب دینے کے بجائے منہ دوسری طرف کر لیا۔ اس دوران وہاں تین
کے بڑے بڑے ہیلی کاپٹر آ گئے تھے۔ قیدیوں کو لاشوں سمیت فوج کے جوان اٹھا کر لے
جانے سے پہلے انہوں نے اس عمارت کو ڈائنامائیٹ لگا کر اڑا دیا تھا۔ علی اور اس کے ساتھی
زاہدان کے ساتھ ایک دوسرے ہیلی کاپٹر میں دارالحکومت کی طرف روانہ ہوگئے۔

☆☆☆☆☆

جنرل زاہدان اور کیپٹن علی سب سے اگلی سیٹوں پر پائلٹ کے پیچھے بیٹھے ہوئے تھے۔ جب
نے جنرل زاہدان اور علی کے لیے ایک پیغام موصول ہونے کا اعلان کیا۔

دونوں نے اپنی سیٹوں سے منسلک ٹیلی فون اپنے کانوں سے لگا لیے۔ دوسری طرف سے
رہی تھی۔

''جنرل زاہدان! میں ڈاکٹر ٹانگو کا ایک ادنیٰ خادم لومبا تم سے مخاطب ہوں۔ تم نے کیپٹن علی
ملک میں بلا کر ناقابل معافی جرم کیا ہے جس کی سزا تمہیں ضرور ملے گی۔ عظیم ٹانگو تمہیں کبھی
نہیں کرے گا۔ کبھی نہیں۔ اپنے انجام کے لیے تیار ہو جاؤ۔''

''شٹ اپ!'' جنرل زاہدان نے چیخ کر کہا اور سلسلہ منقطع ہو گیا۔

اس سے پہلے کہ وہ کوئی بات کرے۔ علی نے پائلٹ کو اپنی طرف مخاطب کیا اور اسے حکم
کہ جس حالت میں بھی وہ ہوں، ہیلی کاپٹر کو نیچے اتار لے۔ پائلٹ نے جنرل زاہدان کی طر
دیکھا جس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ لیکن اسے بھی ابھی تک سمجھ نہیں آئی تھی کہ علی کہ اس حر
کا مطلب کیا ہے۔

''جلدی کرو۔ ایک لمحہ ضائع نہ کرو۔'' علی نے چلاتے ہوئے اسے ہدایت دی۔

پائلٹ نے ہیلی کاپٹر بڑی تیزی سے لینڈ کیا تھا۔ وہ لوگ شہر کے نزدیک ایک سڑک
اترے تھے جس کے دونوں اطراف مصنوعی جنگل موجود تھے۔

''بھاگو۔'' علی نے باہر چھلانگ لگاتے ہوئے انہیں حکم دیا۔ سب اس کے تعاقب
چھلانگیں لگا کر باہر نکل آئے۔ ابھی وہ بمشکل ایک ڈیڑھ فرلانگ ہی دوڑ پائے تھے جب نفس
ایک تیز سیٹی کی آواز گونجی۔ سب کی نظریں آسمان کی سمت لگ گئیں۔ صحرا کے شمال سے انہیں
اڑن طشتری بڑی تیز رفتاری سے اس طرف بڑھتی نظر آ رہی تھی۔

سب لوگ علی کی تقلید میں درختوں کے جھنڈ میں چھپ گئے۔ یہ اڑن طشتری بالکل وہ
تھی۔ جیسی انہوں نے پرتاب نگر میں دیکھی تھی۔ چند منٹ بعد ہی اڑن طشتری ان کے سر
موجود تھی۔ سب اپنی اپنی جگہ چھپے حیرت سے یہ نظارہ کر رہے تھے۔ جب اڑن طشتری سے د
شعاعیں نکلیں اور سڑک پر کھڑا ہیلی کاپٹر بھک کی آواز سے اڑ گیا۔

''تھینک یو علی! میرے دوست تم واقعی ایک عظیم انسان ہو۔ آج پھر تم نے ہمیں بچا
جنرل زاہدان کے منہ سے بے اختیار نکلا اور وہ جوش جذبات سے علی سے بغل گیر ہو گئے۔

دھماکے کی آواز سن کر پولیس وہاں پہنچ گئی تھی۔ تھوڑی دیر بعد ہی وہ پولیس کی گاڑیوں
وہاں سے رخصت ہو رہے تھے۔

''میرے خیال میں تمہارے ملک میں بہت سے اہم لوگ ٹانگو کے قابو میں ہیں۔''
اپنا خدشہ ظاہر کیا۔

''ہاں علی! غدار کہاں نہیں ہوتے۔ ان لوگوں کی وجہ سے تو ایک مرتبہ ٹانگو ہمارے ہاتھوں
ں آ کر نکل گیا تھا۔'' جنرل زاہدان نے لمبا سانس لے کر کہا۔

''کیپٹن علی! اس صحرا کے شمال میں ہماری اور پڑوسی ملک کی سرحد پر ایک سینکڑوں میل
جنگل موجود ہے۔ یہ جنگل اتنا گھنا ہے کہ اس کے درختوں سے سورج کی شعائیں بھی چھن کر اندر
یں جا سکتیں۔ یہاں ایک وحشی قوم آباد ہے جسے اس کم بخت ٹانگو نے الٹے سیدھے کرتب دکھا کر
ا مطیع کر لیا ہے۔ وہ ان کا دیوتا بنا ہوا ہے اور اس نے یہاں اپنے ماتحت دیوتا بھی مقرر کئے ہوئے
ں جو ان جنگلیوں سے اپنی مرضی کا ہر کام لے سکتے ہیں۔ یہ علاقہ اتنا گھنا ہے کہ ہم یہاں کے محل
ع سے واقف ہو ہی نہیں سکتے۔ اس لیے ایئر فورس سے یہاں متعدد مرتبہ بمباری کروانے کے
جود کوئی نتیجہ حاصل نہیں ہوا۔ اس طرح بلا سوچے سمجھے بمباری کروانے سے صرف بے گناہ
گلیوں کی جان ہی جاتی ہے اور کچھ حاصل نہیں ہوتا۔

ایک مرتبہ ہم نے کمانڈوز کی ایک کمپنی یہاں بھیجی تھی، جس میں سے صرف ایک کمانڈو زندہ
کر واپس آ سکا۔ وہ بھی خاصا زخمی تھا اور بعد میں مر گیا۔ اس کی زبانی ہمیں ان تمام واقعات کا علم
ا اور اندازہ ہوا کہ ٹانگو کتنا خطرناک مجرم ہے۔'' وہ تھوڑی دیر کے لیے چپ ہو گئے۔

''لیکن اب مجھے امید ہے کہ تم آ گئے ہو تو اللہ تعالیٰ ضرور ہماری مدد کریں گے۔ اس کے
لاف اپنی مہم کا آغاز کل ہی کر دیں گے اور میں بھی انشاء اللہ تمہارے ساتھ اس مہم پر اس کے
ا قب میں جاؤں گا۔ اس کو ختم کئے بغیر ہم کبھی چین سے زندگی بسر نہیں کر سکتے۔''

''انشاء اللہ اب وہ ختم ہو جائے گا۔'' علی نے بڑے اعتماد سے کہا۔

وہ لوگ ایک محفوظ ٹھکانے پر منتقل ہو گئے تھے۔ علی نے اس رات اعلان کر دیا کہ کل وہ اس
م کا آغاز کرے گا اور وہ لوگ ٹانگو کے تعاقب میں خطرناک جنگلوں میں جائیں گے۔''

دیوتا سے ملاقات

''ولیم! اب تمہاری صلاحیتوں کے امتحان کا وقت آ گیا ہے۔'' کیپٹن علی نے ولیم کو مخاطب کیا۔ وہ اس کے ساتھ ہی ایک گھوڑے پر سفر کر رہے تھے۔

وہ لوگ گھوڑوں پر سوار اب جنگل میں داخل ہو چکے تھے۔ سب نے اپنے اپنے گلے میں خود کار رائفلیں اور دوربینیں لٹکا رکھی تھیں اور ان کی راہنمائی جنرل زاہدان خود کر رہا تھا۔ اس کی عمر تو پینتالیس سال کے قریب رہی ہوگی لیکن اس کی صحت قابل رشک تھی۔ زاہدان کی اپنے ملک کے علاوہ اردگرد کے ممالک میں بھی اچھی شہرت تھی۔ اس نے دنیا کے بڑے بڑے مجرموں پر قابو پایا تھا۔ لیکن ٹانگو کے معاملے میں وہ خود کو بے بس محسوس کرتا تھا۔

جوں جوں وہ درختوں کے سلسلے میں داخل ہو رہے تھے جنگل گھنا ہوتا جا رہا تھا۔ آہستہ آہستہ اندھیرا سا چھانے لگا تھا۔ گھنے اور سایہ دار درختوں سے چھن چھن کر سورج کی روشنی آ رہی تھی۔ راستہ بھی اب بڑا دشوار گزار ہو رہا تھا اور اس راستے پر گھوڑوں کے ساتھ سفر کرنا ذرا مشکل دکھائی دیتا تھا۔

جنرل زاہدان اور کیپٹن علی اپنے ہاتھوں میں پکڑے کلہاڑوں کی مدد سے گو کہ درختوں کی

خوں سے راستہ بنا رہے تھے۔ لیکن اچانک ایک مقام ایسا آیا جہاں سے گھوڑوں کے ساتھ گزرنا نی ناممکن نظر آنے لگا۔

یہ ایک چھوٹی سی ندی تھی جس کے گرداگرد بڑی کانٹے دار جھاڑیوں والی پہاڑیوں تھیں۔ پٹن علی اور زاہدان نے کافی سوچ وبچار کے بعد بجائے کانٹے دار راستوں کے اس ندی کے ریعے سفر کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ انہوں نے درختوں کی ٹہنیوں کی مدد سے رسیاں باندھ کر ایک کشتی ابڑا سا تختہ تیار کر لیا تھا۔

سب نے اپنے گھوڑے یہیں چھوڑ دیے اور اپنی اپنی کمر پر اپنے تھیلے باندھ کر گلے میں آنفل اور دوربینیں لٹکا کر اس تختے پر بیٹھ گئے۔ تختہ پانی کے رخ پر تیرنے لگا۔

اب ایک نئی پریشانی نے گھیر لیا۔ ندی جو پہلے بڑی چھوٹی سی نظر آ رہی تھی۔ جوں جوں وہ گے بڑھے اس کا پاٹ چوڑا ہونے لگا۔ ٹیپو نے ندی کے ایک کنارے پر لگے درختوں کا نظارہ رنے کے لیے اپنی دانست میں دوربین آنکھوں سے لٹکائی تھی جب اچانک وہ چونک پڑا۔ اس نے کیپٹن علی کو مخاطب کیا:

''انکل ادھر دیکھیے!''

کیپٹن علی نے جھٹ دوربین آنکھوں سے لگائی اور دیکھا۔ درختوں کی قطار کے ساتھ ساتھ کچھ ننگ دھڑنگ جنگلی ان پر نظریں جمائے کھڑے تھے۔ پھر ان لوگوں نے ان کی کشتی کے ساتھ ساتھ چلنا شروع کر دیا۔ ان کے ہاتھوں میں نیزے اور بھالے نظر آ رہے تھے اور انہوں نے اپنے سروں پر پرندوں کے پروں کے تاج بھی پہن رکھے تھے یا پھر ایک لنگوٹی ان کے جسم پر موجود تھی۔ یہی شاید ان کا لباس تھا۔

ولیم نے بھی اب اپنی آنکھوں پر دوربین لگائی تھی اور اس طرف دیکھنے لگا تھا۔

''کشتی کو دریا کے درمیان رکھنے کی کوشش کریں۔ یہ لوگ ابھی ہمیں نقصان نہیں پہنچائیں گے البتہ کنارے کے نزدیک ہونا خطرناک ہے۔ ان کے مختلف قبیلوں کی اپنی حدود ہیں اور یہ اپنی حد تک ہمارا تعاقب کریں گے۔ اس کے بعد واپس لوٹ جائیں گے۔'' اس نے سب کو ہدایت

کی۔

علی اور عامر کشتی کے دونوں کناروں پر رائفلوں کو پوزیشن میں لے کر بیٹھ گئے۔ جنرل زاہدان اور ولیم نے ڈنڈے نما چپوؤں کی مدد سے اپنی کشتی کو دریا کے درمیان رکھنے کی کوشش شروع کر دی اور ٹیپو نے آنکھوں سے دوربین لگالی۔ وہ ان جنگلیوں کی نقل و حرکت کا جائزہ لے رہا تھا اور ساتھ ہی انہیں بتاتا جا رہا تھا۔ قریباً آدھ گھنٹہ تک وہ لوگ اسی حالت میں سفر کرتے رہے۔ اب کشتی کی رفتار بھی پہلے سے کچھ زیادہ تیز ہو گئی تھی۔ پھر ٹیپو نے اعلان کیا کہ اب انہوں نے تعاقب کرنا چھوڑ دیا ہے اور سب واپس لوٹ رہے ہیں۔ باری باری سب نے آنکھوں سے دوربین لگا کر اس کی خبر کی تصدیق کر لی اور خدا کا شکر ادا کیا۔

☆☆☆☆☆

ولیم اس دوران بڑی ہوشیاری سے ماحول کا جائزہ لیتا رہا تھا۔ اس نے قریباً آدھ گھنٹہ مزید سفر کرنے کے بعد کشتی کو کنارے کی طرف لگانا شروع کر دیا۔ پھر کشتی کنارے سے جا لگی اور ایک ایک کر کے اس میں سے اترنے لگے۔

کشتی کو انہوں نے یہیں چھوڑ دیا تھا اور اب وہ کسی محفوظ ٹھکانے کی تلاش میں سرگرداں تھے۔

بالآخر ایک ایسی جگہ میسر آ ہی گئی۔ یہ ایک پہاڑی ٹیلہ تھا جس کے اردگرد گھنے درخت ہو کی وجہ سے اسے ایک مورچے کی حیثیت حاصل ہو گئی تھی۔ وہ رات انہوں نے یہیں بسر کر کا ارادہ کر لیا تھا۔ اور اب یہاں باری باری پہرہ دے رہے تھے۔ جنگلی حشرات الارض سے کے لیے انہوں نے اپنے گرد آگ روشن کر دی تھی تاکہ جنگلی جانوروں اور کیڑے مکوڑوں محفوظ رہ سکیں۔ رات وہیں بسر کرنے کے بعد صبح وہ پھر آگے سفر کے لیے تیار تھے۔

جنگلی مقامات ولیم کے بیان کردہ نقشے کے عین مطابق تھے جس سے کیپٹن علی بھی اس ذہانت کی داد دیے بغیر نہ رہ سکا۔ ولیم نے جو کچھ بتایا تھا بالکل ویسے ہی حالات اور ماحول کا سا کر رہے تھے۔ اگلے سفر کے لیے انہوں نے اپنے ساتھیوں کو چند حفاظتی تدابیر بتائیں اور وا

ے۔

ولیم آگے آگے چلتا ہوا ان کی راہنمائی کے فرائض انجام دے رہا تھا اور باقی لوگ فوجیوں طرح ایک خاص ترتیب میں اس کے پیچھے آ رہے تھے۔ اچانک چلتے چلتے وہ رک گیا۔ اپنے ے آنے والوں کو بھی اس نے رکنے کا اشارہ کیا تھا۔ پھر وہ زمین پر لیٹ کر اپنا کان زمین سے لگا کچھ سن گن لینے کی کوشش کرنے لگا۔ دو تین منٹ تک اس پوزیشن میں رہنے کے بعد وہ اٹھ کھڑا ا۔

''ہمارا تعاقب کیا جا رہا ہے۔'' اس نے اعلان کیا۔

''میرا گوشت تو بہت کڑوا ہے۔ اول تو کوئی اسے کھائے گا ہی نہیں۔ اگر کسی نے کھایا بھی تو ے بدہضمی ہو جائے گی۔ اس لیے مجھے تو تعاقب کی کوئی فکر نہیں۔'' عامر کی طرف سے اچانک ہی ی بات کہہ دی گئی کہ جنرل زاہدان بھی بے ساختہ ہنس دیے۔

اس نے اپنی زندگی میں آج تک ایسے دلیر لوگ نہیں دیکھے تھے۔ یہ لوگ تو موت کی گود میں ی قہقہے لگاتے تھے اور بالکل غیر سنجیدہ رہتے تھے۔ ٹیپو بظاہر بچہ سا تھا لیکن وہ بالکل ماہر فوجیوں ے انداز میں ان کا ساتھ دے رہا تھا۔ اس نے جنرل زاہدان کو اپنی کسی حرکت سے ابھی تک ی کم عمری کا احساس نہیں ہونے دیا تھا۔

کیپٹن علی نے سب کو اشارہ کی مدد سے پوزیشنیں سنبھالنے کا حکم دیا تھا۔ اس نے اپنا بیگ ین پر رکھ کر اس میں سے سامان نکال کر جوڑنا شروع کر دیا تھا۔ اور بمشکل دو منٹ بعد ہی اس کے اتھ میں ایک جدید ترین رائفل موجود تھی۔ اس کی ہدایت پر ٹیپو نے سامنے والے ایک درخت پر ورچہ سنبھال رکھا تھا جب ان کی نظر ان تین جنگلیوں پر گئی جو آہستہ آہستہ نیزے تانے انکی طرف ڑھ رہے تھے۔ ٹیپو کے پاس آواز دے کر اپنے ساتھیوں کو خبردار کرنے کا وقت بھی نہ تھا۔

اس نے اپنے ہاتھ میں پکڑے ہینڈ گرینڈ کی پن دانتوں کی مدد سے نکالی اور اللہ کا نام لیکر ان کے عین درمیان گرینیڈ پھینک دیا۔ بم ایک زوردار دھماکے سے پھٹا اور تینوں جنگلیوں کے پرخچے اڑ گئے۔

اس کے ساتھ ہی سارا جنگل عجیب وغریب اور ڈراؤنی چیخوں کی آواز سے کانپنے لگا۔ ہ
ان پر تیروں کی بارش شروع ہوگئی۔ ولیم نے انہیں بتا دیا تھا کہ حالات کیسے پیش آ سکتے ہیں اس لِ
سب نے اپنے آپ کو ان حملوں سے محفوظ رکھا ہوا تھا۔

جیسے ہی ان کی طرف تیر آنے شروع ہوئے۔ انہوں نے ترتیب کے مطابق چاروں طرف
فائرنگ شروع کر دی ابھی چند گولیاں ہی چلی تھیں کہ علی نے سب کو زور سے آواز دے کر فائرنگ
سے منع کیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے اپنے ہاتھ میں پکڑی گن سے تین سمتوں میں ایک ایک فا
کر دیا۔ صرف چوتھی سمت وہ محفوظ رکھی جدھر انہیں سفر کرنا تھا۔ سب حیران رہ گئے۔ تینوں طرف
جنگل کو جیسے آگ ہی لگ گئی تھی۔

صرف تین فائروں نے جنگلیوں کو بھاگنے پر مجبور کر دیا کیونکہ وہ اس آگ کو عذاب الٰہی سمجھ
تھے۔ اپنے پیچھے بھاگتے ہوئے وہ اپنے ساتھیوں کی لاشیں بھی چھوڑ گئے تھے۔

''آئندہ کوئی صاحب ضرورت کے بغیر ایک گولی بھی فائر نہ کریں۔ ہمیں اسلحے کو بہ
سنبھال اور سوچ سمجھ کر استعمال کرنا ہے۔'' اس نے ہدایت دی۔

''میں تو کم از کم ایک گولی اپنے مرنے کے لیے ضرور سنبھال کر رکھوں گا کیونکہ مجھے
وحشیوں کے ہاتھ سے مرنا بالکل پسند نہیں۔'' عامر نے کہا۔

وہ اچانک ایک درخت سے چھلانگ لگا کر ان کے درمیان آ گرا تھا۔ سب دیکھ کر حیران
گئے کہ وہ تو اس جنگل کا کوئی باسی دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے بالکل مقامی جنگلیوں کا سا روپ
رکھا تھا۔ سب باری باری اسے دیکھتے اور مسکرا دیتے۔

☆☆☆☆☆

سب لوگ ایک بار پھر ولیم کے پیچھے پیچھے چل رہے تھے۔ اچانک وہ ایک پتھریلی عما
دیکھ کر رک گئے۔ جنگل میں یہ عمارت بڑی عجیب سی نظر آ رہی تھی۔ یہ عمارت ایک پہاڑی ٹی
بنائی گئی تھی اور تازہ بنی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ کیپٹن علی نے انہیں رکنے کا اشارہ کیا۔ پھر آنکھوں
دوربین لگا کر دیکھا۔ عمارت گرجے کی شکل کی تھی اور اس کے باہر ایک صلیب بھی لٹکتی نظر آ

تھی۔

علی نے دوربین دوبارہ گلے میں لٹکا کر ٹیپو کو اپنے قریب بلایا اور کچھ ہدایات دیں۔ ٹیپو چھپتا
چھپاتا آٹھ دس منٹ بعد ہی اس عمارت کے نزدیک پہنچ گیا۔ یہ ایک معمولی سا کمرہ تھا جو لکڑیوں
اور گارے کی مدد سے بنایا گیا تھا لیکن اس کی شکل ایک گرجے کی طرح نظر آ رہی تھی۔ گرجے کے
باہر ایک گھوڑے کو کھٹا دیکھ کر وہ ٹھٹھک گیا۔ پھر اس کو اس کمرے کی واحد کھڑکی بھی نظر آ گئی۔

ٹیپو کھڑکی کے نزدیک پہنچ گیا۔ گرجے کے اندر سے دو آدمیوں کے زور زور سے بولنے کی
آوازیں آ رہی تھیں۔ وہ لوگ جس زبان میں بات کر رہے تھے وہ ٹیپو کے لیے بالکل اجنبی تھی۔

ہمت کر کے اس نے اپنے دونوں ہاتھ کھڑکی پر جمائے اور بازوؤں کے زور پر اوپر اٹھا کر
کھڑکی جو ٹہنیوں اور پتوں کی مدد سے تیار کی گئی لکڑی کے سوراخ میں جھانک کر دیکھا۔ اندر اسے
ایک پادری اور ایک لمبا تڑنگا سیاہ فام جس نے مہذب دنیا کا لباس پہن رکھا تھا، نظر آیا۔ وہ دونوں
اس وقت کسی بات پر بحث کر رہے تھے۔ ٹیپو کو گو کہ اس زبان کی سمجھ نہیں تھی لیکن اس نے اندازہ لگا
لیا کہ جیسے وہ سیاہ فام حبشی کوئی بات زبردستی منوانے کی کوشش کر رہا ہے اور پادری اس کی بات تسلیم
نہیں کر رہا۔

دو تین منٹ تک اس طرح باتیں کرنے کے بعد سیاہ فام غصے میں کچھ بڑبڑاتا اور اپنے
ہاتھوں سے عجیب عجیب سے اشارے کرتا باہر نکل آیا۔ باہر آ کر اس نے زور سے سیٹی بجائی تو ٹیپو
نے دیکھا کہ وہی گھوڑا ہنہناتے ہوئے اس کے قریب آ گیا۔ سیاہ فام ایک ماہر سوار کی طرح
چھلانگ لگا کر گھوڑے کی پیٹھ پر بیٹھا اور گھوڑا ہوا سے باتیں کرنے لگا۔ اس درختوں اور جھاڑیوں
سے لدے ہوئے راستے پر وہ گھوڑا یوں دوڑ رہا تھا جیسے میدان میں بھاگ رہا ہو۔ ٹیپو جو کھڑکی کے
نزدیک ایک جھاڑی کے پیچھے چھپا ہوا تھا، اٹھ بیٹھا۔ اس کا رخ اپنے ساتھیوں کی طرف تھا۔

اس نے کیپٹن علی کو ساری باتیں بتائیں تو علی اور زاہدان اس کے ساتھ دوبارہ اس طرف
جانے کو تیار ہو گئے۔ باقی لوگوں کو انہوں نے مخصوص حالات کے مطابق ہدایات دے کر وہیں
چھپ کر بیٹھنے اور اس کے سگنل کا انتظار کرنے کی تلقین کی تھی۔

ٹیپو ان کو اسی راستے سے گرجے تک لے آیا۔ اب کھڑکی کے راستے سے جنرل زاہدان اور دروازے کے راستے سے کیپٹن علی اندر داخل ہو گئے۔ ٹیپو باہر چھپا ان کی اگلی ہدایات کا منتظر تھا۔

اندر صرف پادری موجود تھا۔ وہ پہلے تو حیرت کے ساتھ ان دونوں کو دیکھتا رہا۔ پھر اس کے منہ سے نکلا:

''خدا کا شکر ہے۔ تین سال بعد کسی مہذب انسان کی شکل تو نظر آئی۔'' اس کے چہرے سے خوف بالکل جھلک نہیں رہا تھا۔ صرف حیرانگی کے تاثرات موجود تھے۔

''آپ کون ہیں؟'' زاہدان نے پستول اس کی طرف تان کر پوچھا۔

''فی الوقت میرا یہ جواب ہے کہ میں تمہارا دوست ہوں پادری بولا۔

''یہ مکمل جواب نہیں۔'' علی نے اسی پرسکون لہجے میں کہا۔

''دیکھو۔ یہ لمبی کہانی ہے۔ میں تمہیں سب کچھ بتا دوں گا۔ اس وقت میری ایک بات دھیان سے سن لو ورنہ پھر شاید تمہیں پچھتانے کا موقع بھی نہ مل سکے۔ اپنے تمام ساتھیوں کو یہاں بلا لو۔ وہ وہاں بالکل غیر محفوظ ہیں۔'' پادری بولا۔

''کون سے ساتھی؟'' جنرل زاہدان نے بظاہر حیرانگی سے پوچھا۔

''میری بات کا اعتبار کر سکتے ہو تو کر لو۔ مجھے تمام حالات کا علم ہے۔ انہیں یہاں بلا لو۔'' پادری نے دوبارہ پرسکون لہجے میں کہا۔

کیپٹن علی نے اس کی آنکھوں سے آنکھیں ملائیں، چند سیکنڈ کچھ سوچا۔ پھر مخصوص سیٹی بجا کر ٹیپو کو اندر آنے کا اشارہ کر دیا۔ تھوڑی دیر بعد ٹیپو ایک درخت پر چڑھ کر رومال کو ایک خاص انداز سے لہرا کر باقی سب لوگوں کو اس طرف آنے کی ہدایت کر رہا تھا۔

☆☆☆☆☆

پادری نے ان سب کو ایک جنگلی درخت کے پتوں سے تیار کردہ قہوہ بنا کر پلایا اور بتایا کہ اس کے بیشمار فوائد بھی ہیں۔ واقعی وہ قہوہ تھا تو بڑا مزے دار اور عامر نے خاص طور سے بڑا عجیب و غریب منہ بنا کر پیا تھا۔ جیسے ہی ان کے حلق سے نیچے اترا وہ خود کو بالکل تازہ محسوس کرنے لگے۔

پھر پادری نے انہیں اپنی کہانی سناتے ہوئے کہا:

''میں اپنے کچھ ساتھیوں کے ساتھ آج سے دس سال پہلے یہاں تبلیغ کرنے آیا تھا۔ یہاں کے آدم خور قبائل نے ایک ایک کر کے میرے تمام ساتھیوں کی جان لے لی۔ ہمیں کوئی خاطر خواہ کامیابی بھی حاصل نہ ہو سکی۔ اتفاق سے اس قبیلے کا سردار شومبا میرا معتقد ہو گیا اور اس کی وجہ سے میں زندہ بچ گیا ہوں ورنہ میں بھی ان کی خوراک بن چکا ہوتا۔

آج سے تین سال پہلے یہ گرجا بھی شومبا اور اس کے ساتھیوں کی مدد سے میں نے تیار کیا تھا اور اب میرا قیام یہیں ہے۔ میں ان لوگوں میں تبلیغ کرتا رہتا ہوں۔ جس شخص کو تمہارے ساتھی نے دیکھا اس کا نام لومبا ہے اور وہ امریکہ کا رہنے والا مشہور زمانہ قاتل اور ڈاکو ہے۔ ساری دنیا کی حکومتوں کو اس کی تلاش ہے۔ یہ بڑا مکار اور بدمعاش آدمی ہے۔ ان لوگوں نے یہاں اپنا ایک گروہ بنا رکھا ہے۔ ان کے گروہ کا لیڈر ڈاکٹر ٹانگو ہے جو اس علاقے کے لوگوں کو جعلی خدا بنا ہوا ہے اور لومبا نے نزدیک ہی موجود ایک اور قبیلے کے لوگوں کو الٹے سیدھے کمالات دکھا کر خود کو ان کا دیوتا بنا لیا ہے۔ یہ لوگ اسے اپنا دیوتا سمجھتے اور اس کے اشاروں پر کٹ مرنے کو تیار رہتے ہیں۔ لومبا اور اس کے ساتھی بہت طاقتور ہیں لیکن اتنے بھی نہیں کہ با آسانی شومبا پر قابو پا لیں۔ انہوں نے شومبا کے قبیلے کو دبا کر رکھا ہوا ہے۔ آج مجھے لومبا یہ بتانے آیا تھا کہ تم لوگ انہیں تباہ کرنے کا مشن لے کر آ رہے ہو اور اگر میں نے تمہاری مدد کی اور شومبا کو تمہارا ساتھ دینے کو کہا تو میری بھی خیر نہیں ہے۔ وہ مجھے بھی دھمکیاں دے کر چلا گیا جب کہ میں نے اس کی بات پر یقین نہ کیا اور کہا کہ جنگل میں کوئی انسان آ ہی نہیں سکتا۔ مجھے امید تھی کہ ایک روز خدا کی طرف سے کوئی مدد ضرور آئے گی اور ان شیطانوں کا قلع قمع ضرور ہو گا۔ یہ بہت خطرناک لوگ ہیں۔'' یہ کہہ کر پادری انہیں لومبا کے متعلق تفصیلات سے آگاہ کرنے لگا۔

اس کی بیان کردہ بہت سی باتوں کا علم گو کہ انہیں پہلے بھی تھا لیکن علی نے اسے ٹوکنا مناسب نہ سمجھا اور بڑی دلچسپی سے اس کی باتیں سنتے رہے۔ پادری نے ان کا ہر ممکن ساتھ دینے کا وعدہ کیا۔

تھوڑی دیر تک وہ انہیں یہاں کے حالات سے آگاہ کرتا رہا۔ پھر اس نے انہیں ہدایت دی کہ وہ اس گرجے کے بجائے فی الوقت سامنے کہیں چھپ جائیں۔ کیونکہ عین ممکن ہے اس کی نگرانی کی جارہی ہو اور لومبا ان پر بے خبری میں حملہ کردے۔

علی نے اس کی تجویز سے اتفاق کیا اور سب لوگ گرجے کے نزدیک ہی واقع ایک ٹیلے پر مورچہ لگا کر بیٹھ رہے۔ علی نے پادری کو ایک ننھا سا ٹرانسمیٹر دے کر اس کے استعمال کا طریقہ اسے سمجھا دیا تھا اور یہ بھی درخواست کی تھی کہ وہ ان کو حالات سے ضرور آگاہ کرتا رہے۔

جس جگہ انہوں نے ڈیرے لگائے تھے وہ ایسی تھی جہاں سے گرجے پر نظر رکھی جاسکتی تھی۔ حالات کے مطابق وہ لوگ باری باری سوتے اور پہرہ دیتے رہے۔

رات کے دوسرے پہر عامر نے پہرہ دینا تھا لیکن پہلے پہرہ وہ بالکل نہ سو سکا۔ یہاں کے موٹے موٹے جنگلی مچھر ساری رات اس کو کاٹتے رہے۔ جب ذرا آنکھ لگی تو علی نے اسے پہرے کے لئے جگا دیا۔ اب صبح ہونے والی تھی اور اس کی ڈیوٹی اب ختم ہورہی تھی۔ اسے گہری نیند نے آ لیا تھا اور ابھی اس کی بمشکل آنکھ ہی لگی تھی جب اچانک ٹیپو نے اسے جھنجھوڑنا شروع کردیا۔

''انکل اٹھیے! اٹھیے! جانے کی تیاری کیجئے۔''

''اوں ہوں۔'' عامر نے اس طرح منہ پر ہاتھ پھیرا جیسے مکھیاں اڑا رہا ہو۔

ایک مرتبہ پھر ٹیپو نے اسے جھنجھوڑا:

''بھئی کیا بات ہے۔ سونے دو۔'' عامر نے اٹھتے ہوئے کہا۔

''آپ سو گئے تو پھر سوتے ہی رہ جاؤ گے۔'' قریب ہی سے کیپٹن علی نے کہا۔

''ہمارے مقدر ایسے کہاں۔'' عامر نے پھرتی سے اٹھتے ہوئے جواب دیا۔

تھوڑی دیر بعد وہ لوگ ناشتہ کررہے تھے۔ ابھی تک پادری کی طرف سے کوئی خاص اطلاع نہیں ملی تھی۔ نہ ہی کسی نے اس سے پھر رابطہ قائم کیا تھا۔

جب سے پادری نے شومبا کے قبیلے کو کچھ مذہبی تعلیم دینی شروع کی تھی ان لوگوں نے آدم خوری ترک کردی تھی۔ اور دوسرے قبائل کی نسبت خاصے مہذب ہوگئے تھے۔ پادری اپنے ساتھ

کچھ سبزیوں کے علاوہ کچھ بیج لے آیا تھا اور اس نے ان لوگوں کو کاشتکاری کے طریقوں سے آگاہ کرنا شروع کردیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ انہیں گرجے کے صحن میں کچھ سبزیاں بھی اگی ہوئی نظر آئی تھیں۔ یہ لوگ شکار کی تلاش میں اکثر سفر کرتے رہتے تھے اور جب سے آدم خوری کا سلسلہ ختم ہوا تھا انہیں شکار کی تلاش زیادہ ہی رہنے لگی تھی۔

جب کبھی اس سلسلے میں یہ لوگ سفر کرتے ان کے جھونپڑوں میں صرف عورتیں اور بچے ہی رہ جاتے یا پھر ان کی حفاظت کے لئے کچھ بوڑھے جنگی یہاں رہ جاتے۔ باقی تمام نوجوان عموماً شکار کی مہم پر ہی رہا کرتے تھے۔ یہ لوگ کئی کئی ہفتے کا اکٹھا شکار کرکے لایا کرتے پھر اسے ختم کرنے کو یہیں موجود رہتے۔

آج کل بھی شومبا اسی مہم پر نکلا ہوا تھا ورنہ پادری اب تک اس کی ملاقات علی اور اس کے ساتھیوں سے ضرور کروا دیتا۔ ٹانگو نے محض اس خدشے کے پیش نظر ابھی تک پادری کو نہیں مروایا تھا کہ وہ اس طرح خوامخواہ شومبا کی دشمنی مول لے لیتا اور اس جنگلی علاقے میں وہ اپنے دشمن پیدا کرکے اپنے لئے مشکلات کھڑی کرنا نہیں چاہتا تھا۔ یہی تو ایک جگہ تھی جہاں اس کے دشمن موجود نہیں تھے ورنہ تو مہذب دنیا کی ساری پولیس اس کی دشمن تھی۔

اسے ہر وقت اپنے ان ذخائر کی فکر امن گیر تھی جن کو اس نے ان جنگلوں میں چھپا رکھا تھا۔ اگر وہ یہاں کسی لڑائی میں الجھ جاتا تو پھر ان ذخائر کے نقصان کا اندیشہ موجود تھا۔

☆☆☆☆☆

رات کے قریباً دس بجے کا عمل تھا جب کیپٹن علی ولیم اور ٹیپو اس سمت میں جنگلوں کے بھیس میں سفر کررہے تھے جس سمت پادری نے لومبا کے ٹھکانے کی نشان دہی کی تھی۔ آج تک پادری نے ان لوگوں کا ٹھکانہ نہیں دیکھا تھا۔ اس نے اندازے سے ہی انہیں بتایا تھا اور اب کیپٹن علی ولیم اور ٹیپو اس طرف جارہے تھے۔ علی نے عامر کو یہاں سامان کی حفاظت کیلئے جنرل زاہد ان کے ساتھ ہی چھوڑ دیا تھا۔ اس کا مقصد فی الحال حالات کا جائزہ لے کر کوئی حکمت عملی تیار کرنا تھا۔

وہ جنگلیوں کی طرح ہاتھوں میں نیزے تھامے پادری کی بتائی ہوئی سمت میں سفر کررہے

تھے جب اچانک زمین نے ان کے پاؤں پکڑ لئے۔ وہ گڑگڑاہٹ ایسی ہی زوردار تھی۔ علی نے فوراً اندازہ لگالیا کہ ان لوگوں نے کمال ہوشیاری سے یہاں چاروں طرف لاؤڈ سپیکر چھپا رکھے ہیں جن کا کنٹرول کہیں دور موجود ہے جس کے ذریعے یہ آوازیں پیدا کی جاتی ہیں۔ آواز بالکل جنگی جہاز کے انجن جیسی تھی۔

اس کے ساتھ ہی ولیم نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ یہ مخصوص اشارہ تھا۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہ اپنے نزدیک ایک گھنے درخت کے پتوں میں ایک موٹی سی ٹہنی پر چھپے بیٹھے یہ نظارہ دیکھ رہے تھے۔ اگر اس درخت کی طرف کوئی روشنی آتی تو بھی ان کے نظر آنے کا خطرہ نہیں تھا۔

گڑگڑاہٹ اب ایک تیز وسل کی آواز میں بدل گئی اور یک دم سامنے کا سارا علاقہ روشنی سے منور ہوگیا۔ انہوں نے دیکھا' سامنے ایک بڑا میدان تھا جس کے ایک کونے میں نیم دائرے کی شکل میں ان لوگوں کے جھونپڑے بنے ہوئے تھے۔ جھونپڑوں کے باہر مختلف مقامات پر آگ کے الاؤ روشن نظر آرہے تھے۔ انہوں نے دیکھا کہ جنگلی اپنی جھونپڑیوں سے نکل کر نیم دائرے کی شکل میں اس الاؤ کے گرد جمع ہوگئے تھے۔

اچانک ایک حیرت انگیز منظر نے انہیں چونکا دیا۔ ان کی آنکھوں نے دیکھا اس میدان کے ایک کونے سے دھماکہ ہوا بالکل یوں جیسے زمین پھٹی ہو' اور ایک سنہری کرسی پر ایک ٹھگنا سا آدمی برآمد ہوا جس کے سر پر کسی بھیڑیے کی گردن سجی ہوئی تھی۔ کرسی کا رنگ سنہری تھا اور اس پر موجود اس جعلی دیوتا نے کالے کپڑے پہن رکھے تھے۔ ان کپڑوں میں سے اس کے دو کے بجائے چار بازو نظر آرہے تھے۔

''یہی ہے ڈاکٹر ٹانگو۔'' ولیم نے سرگوشی میں بتایا۔

''مجھے معلوم ہے۔'' علی بولا۔

''کم بخت نے کس طرح ان لوگوں کو بے وقوف بنا رکھا ہے۔'' ٹیپو نے سرگوشی کی۔

''ابھی آپ نے دیکھا ہی کیا ہے۔ اس شیطان کے بڑے بڑے خطرناک روپ ہیں۔'' ولیم بولا۔

''تینوں خاموشی سے نظارہ کرنے لگے۔ جب ٹانگو نے اپنا جھکا ہوا سر سیدھا کیا تو اس کی آنکھوں سے دو روشنی کی لکیریں باہر کو لپکیں۔ اس کے ساتھ ہی ایک گونج دار آواز پیدا ہوئی اور تمام جنگلی سجدے میں گر گئے۔ پھر انہوں نے ایک لمبے تڑنگے سیاہ فام کو اسی طرف قدم بڑھاتے دیکھا۔

''یہ لومبا ہے۔'' ٹیپو بولا۔

لومبا گردن جھکائے اس کے نزدیک پہنچ گیا۔ اس نے اپنی گردن جھکا دی تھی۔ ڈاکٹر ٹانگو نے اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر گویا اسکو ''آشیر باد'' دے دی تھی۔ پھر اچانک سیاہ فام لومبا تن کر کھڑا ہوگیا اور دونوں ہاتھ باندھ کر الٹے قدموں واپس لوٹنے لگا۔ جب وہ جنگلیوں کے نزدیک پہنچا تو اچانک ایک زوردار دھاڑ گونجی۔ اس کے ساتھ ہی ٹانگو کے منہ سے آگ خارج ہونے لگی۔ بالکل یوں جیسے تماشہ دکھانے والے مداری اپنے منہ سے نکالا کرتے ہیں۔

جنگلی جو اٹھ کر کھڑے ہوگئے تھے' اس دھاڑ کے ساتھ ہی دوبارہ سجدہ ریز ہوگئے۔ اس کے ساتھ ہی کرسی دیوتا سمیت زمین میں غائب ہوگئی۔ انہوں نے دیکھ لیا تھا کہ یہاں زمین میں خود کار زینے نصب ہیں جن کے ذریعے اس کرسی کو کنٹرول کیا جاتا ہے۔

بہرحال جو بھی تھا' ٹانگو نے ان وحشی لوگوں کو اپنا غلام بنا رکھا تھا اور وہ اپنے دیوتا کے اشارے پر کٹ مرنے کو تیار تھے۔ کرسی غائب ہوتے ہی روشنی بھی غائب ہوگئی۔ اب وہاں صرف آگ کے الاؤ دکھائی دے رہے تھے۔ وہ لوگ واپس اپنے ٹھکانے کی طرف مڑ گئے۔

ویل ڈن

تینوں دبے پاؤں اپنے ٹھکانے کی طرف واپس لوٹ رہے تھے۔ ابھی وہ گرجے سے بمشکل ایک فرلانگ دور ہی تھے جب ٹیپو کو زمین اپنے قدموں تلے سرکتی محسوس ہوئی۔ ان کے سامنے ایک شیر کھڑا تھا۔ اتنا بڑا شیر آج سے پہلے اس نے کسی سرکس یا چڑیا گھر میں بھی نہیں دیکھا تھا۔

کیپٹن علی کا ہاتھ فوراً اپنے جنگلی جانگیہ کے ساتھ لگے ہولسٹر کی طرف گیا جہاں ایک ریوالور موجود تھا۔ لیکن ولیم نے اسے فوراً منع کر دیا۔ دونوں حیرانگی سے ولیم کو دیکھنے لگے۔ ولیم شیر کی آنکھوں میں آنکھیں گاڑے کھڑا تھا۔ اس نے بڑے نامحسوس طریقے سے اپنے ہاتھ میں پکڑی ٹارچ روشن کر لی تھی۔ یہ ٹارچ وہ اپنے ساتھ ہی لے گئے تھے۔

ٹارچ کی روشنی شیر کی آنکھوں میں پڑ رہی تھی اور ولیم کے منہ سے عجیب و غریب آوازیں نکلنی شروع ہو گئیں۔ بالکل یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے ولیم شیر کو کچھ سمجھانے کی کوشش کر رہا ہے۔

شیر کی غراہٹ ابھی تک جاری تھی۔ لیکن جیسے جیسے ولیم کے منہ سے نکلنے والی آوازوں میں اضافہ ہو رہا تھا' شیر کی غراہٹ کم ہوتی جا رہی تھی۔ یوں دکھائی دیتا تھا جیسے وہ نارمل حالات میں واپس لوٹ رہا ہو۔

اب ان کے دیکھتے ہی دیکھتے ولیم نے اس کی طرف بڑھنا بھی شروع کر دیا تھا۔ ٹیپو ایک بار تو سہم کر رہ گیا لیکن فوراً ہی اسے سرکس والا ولیم یاد آ گیا جو ایک ہی وقت میں تین تین شیروں کو ریچھوں کی طرح قابو کر لیا کرتا تھا۔ اس وقت بھی ولیم کے منہ سے کچھ ایسی ہی آوازیں نکلا کرتی تھیں اور وہ اپنے شیروں کے ایسے ایسے کمالات لوگوں کو دکھایا کرتا تھا کہ وہ دنگ رہ جایا کرتے تھے۔

اس لمحے ان کے سامنے وہی سرکس والا ولیم موجود تھا۔ جس نے اب شیر کے سر پر ہاتھ رکھ کر اسے رام کرنا شروع کر دیا تھا۔ اس کے منہ سے بدستور آوازیں نکل رہی تھیں اور اس کا ہاتھ آہستہ آہستہ شیر کے جسم پر چل رہا تھا۔ ان کے دیکھتے ہی دیکھتے شیر نے ولیم کے قدموں میں لوٹنا شروع کر دیا تھا۔

''ویل ڈن!'' بے ساختہ کیپٹن علی کے منہ سے نکلا۔

''واہ انکل!'' ٹیپو نے بے اختیار داد دی۔

اسے اب اچھی طرح سمجھ آ گئی تھی کہ کیپٹن علی نے آخر ولیم کو اپنے ساتھ اس مہم کا حصہ کیوں بنایا ہے۔ ولیم نہ صرف ٹانگو کا بھیدی تھا بلکہ ایسے خونخوار جنگلی درندوں کو اپنی انگلیوں پر نچانے کا فن بھی اسے اچھی طرح آتا تھا جن سے ان لوگوں کا واسطہ پڑ سکتا تھا۔

''اگر آپ اجازت دیں تو صرف تین دن کی تربیت کے بعد اس شیر کو آپ کی سواری کے لئے بنا سکتا ہوں۔'' ولیم نے اس کی کمر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے علی کو مخاطب کیا۔

علی ٹھٹھک کر رہ گیا۔

ولیم نے شاید یہ بات کسی خاص منصوبے کے تحت کہی تھی۔ پھر اسے ولیم کی بات سمجھ آ گئی۔ اس کے ذہن نے ایسا شاندار منصوبہ تیار کیا تھا کہ وہ اس شیر کی مدد سے ٹانگو کو تگنی کا ناچ نچا سکتا تھا۔

''ارے واہ!'' وہ خوشی سے اچھل ہی پڑا۔

ولیم بھی اس کی بات سمجھ کر مسکرا دیا۔ دونوں نے ایک ہی نتیجہ اخذ کیا تھا لیکن ابھی تک ٹیپو کو یہ بات سمجھ نہیں آ سکی تھی۔ اب ولیم نے آگے آگے چلنا شروع کر دیا تھا اور اس کے پیچھے پیچھے

شیر ایک پالتو کتے کی طرح چلتا ہوا آ رہا تھا۔ ان دونوں کے پیچھے علی اور ٹیپو آ رہے تھے۔

☆☆☆☆☆

گرجے کے باہر وہ سب بے چینی سے ان کے منتظر تھے۔ جب انہوں نے تینوں کے ساتھ شیر کو بھی آتے دیکھا تو چکرا کر ہی رہ گئے۔ جنرل زاہدان کا ہاتھ تو بے اختیار اپنی طاقتور رائفل کی طرف بڑھا تھا لیکن عامر پرسکون اپنی جگہ کھڑا رہا۔ اسکی شکل پر نظر پڑتے ہی جنرل زاہدان نے ہاتھ مسکرا کر رائفل ایک طرف رکھ دی۔

گرجے سے ملحقہ ایک چھت کے بغیر چار دیواری کو پادری نے لکڑی کے مضبوط تختوں کے دروازے سے بند کر رکھا تھا۔ ولیم کی ہدایت پر ان لوگوں نے وہ دروازہ ہٹا دیا۔ ولیم نے شیر سے پھر اس زبان میں کچھ کہنا شروع کر دیا۔ پھر سے پچکارتے ہوئے اپنے ساتھ اس باڑے کی طرف لے گیا۔ باڑے میں شیر کو داخل کرنے کے بعد وہ دروازہ اس نے بند کیا اور اپنے بیگ کی طرف گیا۔

سب لوگ حیرت سے اس کی حرکتوں کو دیکھ رہے تھے۔ ان کے دیکھتے ہی دیکھتے اس نے اپنے بیگ میں سے ایک سفید سے سفوف والی شیشی نکالی۔ پھر کیپٹن علی سے کہا کہ صبح جو ہرن شکار کیا گیا تھا اس کا جتنا گوشت بھی بچا ہو، لے آیئے۔

تھوڑی دیر بعد وہ ہرن کی ران پر وہ سفوف چھڑک رہا تھا۔ پھر وہ دوبارہ باڑے کی طرف گیا اور ان کے سامنے اس نے شیر کو اپنی مخصوص زبان میں مخاطب کرنے کے بعد وہ ران کھانے کی دعوت دی۔ شیر نے اطمینان سے ران چبا ڈالی اور ولیم دروازہ بند کر کے باہر نکل آیا۔

اس دوران کیپٹن علی، پادری، زاہدان اور عامر کو ساری روداد سنا چکا تھا۔

"واہ رے ولیم!" سب کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

"میں نے اسے صبح تک گہری نیند سلا دیا ہے۔ اس دوائی کی مدد سے اس کے دھاڑنے کی صلاحیت خاصی کم پڑ گئی ہے۔ آپ لوگ یوں سمجھئے کہ ہم ایسی ادویات کی مدد سے ان جانوروں کی خطرناک حیوانی جبلت کو قابو کرتے ہیں۔ اس طرح ان کی طبیعت خونخواری کی طرف مائل

ہوتی۔"

"اوہ انکل! میں اب سمجھا کہ آپ لوگ آخر شیر اور بکری کو سرکس میں ایک ہی جگہ کیسے اکٹھا کر دیتے ہیں۔" ٹیپو بولا۔

"شاباش! تم واقعی ذہین بچے ہو۔" ولیم نے جواب دیا۔

"اور میرے بارے میں کیا خیال ہے آپ کا؟" عامر بولے بغیر نہ رہ سکا۔

"اس کا جواب میں زیادہ بہتر دے سکتا ہوں۔" اس کے بجائے علی نے کہا۔

"آپ تو رہنے ہی دیجئے۔" عامر نے جلے کٹے لہجے میں اس انداز سے کہا کہ وہ لوگ مسکرائے بغیر نہ رہ سکے۔

ولیم نے پادری کو سمجھا دیا تھا کہ وہ اس شیر کی مدد سے کیا کرنے والے ہیں۔ اس نے پادری سے درخواست کی تھی کہ جس طرح بھی ممکن ہو وہ اس شیر پر لومبا کی نظر نہ پڑنے دے ورنہ کوئی مسئلہ بھی جنم لے سکتا ہے۔

"میں ہر ممکن کوشش کروں گا۔" پادری نے اسے داد طلب نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "لیکن اس کی خوراک کا بندوبست؟"

اس کی فکر آپ بالکل نہ کریں۔" جنرل زاہدان قریب ہی سے بولا۔ "کل صبح تک آپ کو اس کیلئے خاصی خوراک مل جائے گی۔"

"اگر ایمرجنسی آ جائے تو میں حاضر ہوں۔ کم از کم بعد میں کوئی یہ تو کہہ سکے گا کہ مجھے شیر نے کھا، کسی گیدڑ نے نہیں۔" عامر بولا۔

"انہیں کہنے کی ضرورت نہیں۔ میرے ذہن میں یہ بات پہلے سے موجود تھی۔" علی نے کہا۔

"میں نے آپ سے یہی توقع رکھی ہے۔" عامر نے کہا اور سب مسکرا دیئے۔

باتوں باتوں میں اب صبح ہونے کو آ رہی تھی۔ جنرل زاہدان اور علی تو شیر کیلئے شکار کو گھوڑے چل دیئے۔ باقی لوگ اپنے سلیپنگ بیگز میں گھس گئے۔ دونوں کی واپسی قریباً دوپہر کے

نزدیک ہوئی۔انہوں نے ایک جنگلی بھینسا اور دو ہرن شکار کیے تھے۔اور انہیں درختوں کی شاخوں کی مدد سے تیار کردہ سٹریچروں پر لاد کر اٹھاتے ہوئے یہاں تک لائے تھے۔

☆☆☆☆☆

ان لوگوں نے اب وقت ضائع کرنے کی بجائے ٹانگو کے ہیڈ کوارٹر کو تلاش کرنے کا فوری فیصلہ کر لیا تھا۔اس سے پہلے کہ ٹانگوان کی آمد سے خبردار ہوتا، انہیں اس کے ٹھکانے کا پتہ لگانا تھا۔ خصوصاً اس مقام کا جہاں اس نے اپنی خطرناک ایجاد کو ذخیرہ کر رکھا تھا جس کے بل بوتے پر وہ ساری دنیا پر حکومت کے خواب دیکھ رہا تھا۔

شومبا ابھی تک واپس نہیں لوٹا تھا لیکن پادری نے انہیں بتایا تھا کہ وہ اب ایک دو روز ہی میں واپس لوٹ آئیگا۔

کیپٹن علی نے دو پارٹیاں بنالی تھیں۔ایک پارٹی میں علی اور ولیم شامل تھے، دوسری پارٹی جنرل زاہدان، عامر اور ٹیپو پر مشتمل تھی۔انہوں نے دو مختلف سمتوں میں سفر کرنا اور پھر اس ٹھکانے پر لوٹ کر واپس آنا تھا۔ان کے پاس اس سلسلے میں جدید ترین آلات موجود تھے جن کی مدد سے کسی بھی زیر زمین پناہ گاہ کا پتا لگایا جا سکتا تھا اور اس کے پہلے ولیم نے پادری کو کچھ محلول تیار کر کے دیے تھے اور ہدایت کی تھی کہ شیر کو وقتاً فوقتاً پلاتا رہے۔

اگلے روز علی الصبح وہ اپنے اپنے مشن پر روانہ ہو گئے۔

کیپٹن علی اور ولیم جنوب مغرب کی سمت اور دوسری پارٹی شمالی مشرق کی سمت سفر کر رہی تھی۔وہ لوگ اب گرجے سے بہت دور آ گئے تھے۔عامر جنرل زاہدان کی جسمانی پھرتی پر حیران تھا۔وہ نوجوانوں کی طرح بھاگ بھاگ کر ان کے آگے آگے چل رہا تھا۔انہیں مسلسل سفر کرتے پانچ گھنٹے ہونے کو آئے تھے لیکن ابھی تک کوئی سگنل محسوس نہیں ہو رہا تھا۔چلتے چلتے اچانک عامر نے جنرل زاہدان کو مخاطب کیا:

''جنرل صاحب! اب میں نے وہ سب کچھ نکال دیا ہے۔''

''کیا مطلب؟ کیا نکالدیا ہے؟'' جنرل نے چونکتے ہوئے گردن گھما کر پوچھا۔

''وہ بائیونک سامان جو میرے جسم میں فٹ تھا اور روبوٹ کی طرح کام کرتا رہتا تھا۔''

جواب میں جنرل زاہدان نے قہقہہ بلند کیا۔اسے عامر کی بات کی اب سمجھ آ گئی تھی۔

''بھئی تم جوان آدمی ہو۔اتنا تو ہم روزانہ ورزش کے لیے پیدل چل لیا کرتے ہیں۔'' وہ بولے۔

''وہ تو ٹھیک ہے جناب۔لیکن ادھر ہماری طرف ایک اور رواج بھی ہے۔'' عامر بولا۔

''وہ کیا؟''

ہم لوگ اتنی ورزش کے بعد کچھ کھانے کی ضرورت بھی محسوس کرتے ہیں۔یقین نہ آئے تو میرے ساتھی سے پوچھ لیں''۔اس نے ٹیپو کی طرف اشارہ کیا۔

''کیوں بھئی؟'' جنرل نے مسکراتے ہوئے ٹیپو کی طرف دیکھا۔

''میرے خیال سے ایسی تو کوئی بات نہیں؟'' ٹیپو نے اس انداز سے کہا کہ جنرل فوراً ہنس دیا۔

''ٹھیک ہے۔لیکن میں چاہتا ہوں کہ بھرے ہوئے پیٹ کے ساتھ ان آدم خوروں کی خوراک کا حصہ بنوں۔ورنہ میری موت کے بعد بھی یہ مجھے بددعائیں دیتے رہیں گے۔دوسری صورت میں بے چارے سیر ہو کر تو کھائیں گے مجھے۔'' عامر نے کہا۔

''اچھا تم کہتے ہو تو کھا لیتے ہیں۔'' جنرل نے کہا۔

تینوں ایک گھنے درخت کے تنے کے ساتھ لگ کر بیٹھ گئے۔انہوں نے اپنے منہ مختلف اطراف میں کیے ہوئے تھے تاکہ کسی سمت سے ہونے والے حملے سے باخبر رہا جا سکے۔کھانے کے خاتمے پر ٹیپو نے عامر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''انکل! اب قیلولہ کے متعلق کیا خیال ہے؟''

''بہ خوردار! تمہارے گرو تو رات کو سونے کی اجازت نہیں دیتے۔یہ تم کو دوپہر کی نیند کیسے یاد آ گئی۔''

''ایسے ہی انکل! میں نے سوچا وہ بھی تو صحت کے لیے ضروری ہے۔'' ٹیپو نے اسے چھیڑا۔

صحت کے لیے تو اور بھی بہت کچھ ضروری ہے۔"

عامر بولا۔

"وہ کیا؟"

"اپنا گھر۔ رات کو سکون کی نیند۔ وقت پر کھانا۔ وغیرہ وغیرہ۔ یہ ٹانگو صاحب قبلہ نے بھی نہ جانے یہی جگہ مرنے کے لیے کیوں پسند فرمائی ہے۔ اگر کسی مہذب آبادی میں ڈیرا لگا لیا ہوتا تو بہتوں کا بھلا ہو جاتا۔ اب یہ کہاں کی شرافت ہے کہ ہم تو موصوف کے تعاقب میں جنگلوں کی خاک چھان رہے ہیں اور وہ کسی گوشۂ استراحت میں آرام فرما رہے ہوں گے یا پھر اپنی پوجا کروا رہے ہوں گے۔"

"ابھی تو نہ جانے کہاں کہاں جانا ہوگا۔ ٹیپو بولا۔

"بے فکر رہو برخوردار! ابھی تو ہم نے جنگل ہی دیکھے ہیں۔ مجھے تو لگتا ہے بہت جلد ہمیں صحرائے گوبی بھی عبور کرنا پڑے گا۔ اور ہو گا یہ کہ موصوف ٹانگو صاحب کسی مہذب ملک کے ڈرائنگ روم میں نیند کے مزے لوٹتے گرفتار ہو جائیں گے۔" عامر بولا۔

"اب چلو گے بھی یا باتیں ہی کرتے رہو گے۔" جنرل زاہدان جو اب ان کے مزاج شناس ہو گئے تھے، بولے۔

"ارے ہمیں تو خیال ہی نہیں رہا۔" عامر نے اٹھ کر کپڑے جھاڑتے ہوئے کہا۔

☆☆☆☆☆

ابھی وہ اپنی سمت میں بمشکل ایک ڈیڑھ فرلانگ مزید چل پائے تھے جب عامر نے اچانک جنرل زاہدان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے رکنے کا اشارہ کیا۔ اس نے جنرل کو اپنے بائیں طرف جھاڑیوں میں نقل و حرکت کا احساس دلایا۔ جنرل نے اس طرف دیکھا اور اثبات میں گردن جھکا دی۔ اس کے ساتھ ہی عامر نے ٹیپو کو اشارہ کیا۔ وہ بندر کی سی پھرتی سے ایک گھنے اور اونچے درخت پر چڑھ گیا۔

درخت سے اس نے چاروں طرف نظریں دوڑائیں پھر نیچے جھک کر عامر کو مخصوص قسم کے

ارے سے بتایا کہ وہ لوگ تو چاروں طرف سے بری طرح گھیرے میں آ چکے ہیں۔ عامر نے ہلکا اشارہ کیا تو وہ درخت پر اونچا ہی اونچا چڑھتا چلا گیا۔ پھر اس نے لنگور کی طرح خود کو ایک گھنی شاخ میں چھپا لیا۔ اب وہ حملہ آوروں کی نظروں سے اوجھل ہو چکا تھا۔

عامر کے اشارے پر جنرل زاہدان نے فوراً اپنے ننھے سے ٹرانسمیٹر پر علی سے رابطہ کیا اور اسے موجودہ صورت حال سے آگاہ کر کے ٹرانسمیٹر کو وہیں جھاڑیوں میں چھپا دیا۔

اس کے ساتھ ہی عامر نے اپنے گلے میں لٹکتے ایک راکٹ کے زیریں حصے کو دبا دیا۔ جیسے اس نے اس حصے کو دبایا، یہاں سے کچھ فاصلے پر موجود کیپٹن علی کے ہاتھ میں پکڑے ایک ننھے سے ٹی وی نما ریڈیو کی سکرین پر کچھ ہندسے ابھرنے اور غائب ہونے لگے۔ وہ بڑی ذہانت سے ان ہندسوں کو حفظ کر رہا تھا۔ اس لاکٹ کے ذریعے اب اسے علم ہوتا جا رہا تھا کہ وہ لوگ کس جگہ کے بارے میں آئے ہیں۔ یہ لاکٹ اپنی نشان دہی کروانے کی صلاحیت رکھتا تھا۔

☆☆☆☆☆

انہوں نے آگے کی سمت چلنا شروع کر دیا۔

ابھی بمشکل چند گز ہی چل پائے تھے کہ ایک آواز انہیں سنائی دی۔ "ڈاکٹر ٹانگو اپنے دوستوں کو خوش آمدید کہتا ہے۔ میں نے سوچا تم لوگ کہاں مجھے ڈھونڈتے اور پریشان ہوتے پھرو گے۔ کیوں نہ میں خود ہی تم سے ملاقات کر لوں۔ جنرل زاہدان یہ لوگ تو مرنے آئے ہی تھے۔ تم ان کے ساتھ کیوں چلے آئے۔ ایک مرتبہ تم میرے ہاتھوں سے نکل گئے تھے۔ اب میں یہ غلطی نہیں دہراؤں گا۔ ایک بات کا خیال رکھنا، تمہارے ساتھ بہت چالاک آدمی موجود ہے۔ اس کے چکر میں آ کر اپنی جان سے ہاتھ نہ دھو بیٹھنا۔ تمہارے ساتھ تو کوئی سودے بازی تمہاری جان لے لے گی۔ لیکن اس کی جان کی ضمانت میں نہیں دے سکتا۔ برائے مہربانی اب تم لوگ اپنے ہتھیار اور تمام فضول چیزیں پھینک دو۔ میں پھر درخواست کروں گا کہ کوئی چالاکی نہ دکھانا۔"

جنرل زاہدان کا چہرہ غصے سے لال سرخ ہو رہا تھا۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ اس کم بخت کو کچا چبا جائے لیکن وہ بے بس تھا۔ اس نے عامر کی طرف دیکھا جس کے چہرے پر سب سابق وہی

مسکراہٹ نظر آ رہی تھی۔ دونوں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں کچھ مشورہ کیا اور اپنے ہتھیار پھینک دیے۔ البتہ ایک چھوٹا سا اور انتہائی طاقت ور بم ابھی تک جنرل زاہدان نے اپنی جیب میں رکھا ہو تھا۔

ہتھیار پھینکتے ہی انہیں تین اطراف سے آدم خوروں نے گھیرے میں لے لیا۔ وہ انہیں خا سمت کی طرف ہانکتے ہوئے لے جا رہے تھے۔ جس راستے پر وہ لوگ تھوڑی دیر بعد پہنچے، دونو نے نوٹ کیا کہ یہ راستہ خاص طور پر سے تیار کیا گیا ہے کیونکہ جیسے ہی وہ اس راستے سے ہٹ کر چلنے کی کوشش کرتے، جنگلی انہیں ہانک کر دوبارہ اسی راستے پر ڈال دیتے۔

''میرا خیال ہے ٹانگو نے اس راستے پر کوئی ریڈار فٹ کیا ہوا ہے تاکہ ہماری نقل و حرکت پر مکمل توجہ رکھ سکے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ لوگ ہمیں اس راستے پر چلنے پر مجبور کر رہے ہیں۔'' عام بولا۔

''میرا بھی یہی خیال ہے۔'' جنرل زاہدان نے کہا۔

اب ان کو ایک میدانی علاقہ نظر آنے لگا تھا جس کے ایک کنارے پر ان لوگوں کو جھونپڑیاں بھی بنی ہوئی تھیں۔ جنگل کے خاتمے پر انہیں ایک پلیٹ فارم سا بنا ہوا نظر آیا۔ جیسے ہی وہ لوگ میدان میں داخل ہوئے۔ انہیں رکنے کا حکم ملا۔

''جنرل زاہدان!'' ٹانگو کی آواز سنائی دی۔ ''میں نے تم سے کہا تھا کہ زیادہ چالاکی دکھانا۔ تم کتنے بھی ہوشیار بنو، ٹانگو کے نزدیک تمہاری کوئی حیثیت نہیں ہے تمہیں حکم دیا گیا تھا کہ تمام غیر ضروری اشیاء پھینک دو۔ مگر تم نے میرے حکم کی خلاف ورزی کی ہے۔ میں ان لوگوں کو اشارہ کروں تو یہ ابھی تمہاری تکا بوٹی کر دیں گے۔ لیکن اپنے خاص دوستوں کو میں اپنے ہاتھ سے مارا کرتا ہوں۔ ٹانگو کے بھی اپنے کچھ اصول ہیں۔ تم وہ بم ناکارہ کر کے اپنے دائیں ہاتھ نظر آ رہے والے جوہڑ میں پھینک دو اور اپنے دوست سے کہو کہ اپنے گلے سے لاکٹ اتار کر پھینک دے۔''

اس کے ساتھ ہی جنگلیوں کو ان کی زبان میں کچھ کہا گیا جو ان دونوں کے پلے نہیں پڑا اعلان کے خاتمے پر تمام جنگلی ایک طرف ہٹ گئے۔ وہ اپنے ہاتھوں کی مدد سے سامنے بنے ایک

جوہڑ کی طرف اشارہ کر رہے تھے۔ جیسے کہہ رہے ہوں کہ اپنی چیزیں وہیں پھینک دو۔

جنرل زاہدان نے بادل نخواستہ بم نکال کر جوہڑ میں پھینک دیا۔ انہوں نے دانستہ اسے ناکارہ نہیں کیا تھا۔ انہیں اب بھی امید تھی کہ یہ بم جلد یا بدیر ضرور پھٹ جائے گا۔

عامر نے اپنے گلے سے لاکٹ اتارا اور جان بوجھ کر سامنے نظر آنے والے ایک جنگلی کے نزدیک پھینک دیا۔ اس نے خاص خیال رکھا تھا کہ لاکٹ مخصوص راستے سے ہٹ کر گرے تاکہ ٹانگو کو سکرین پر نظر نہ آ سکے۔ جنگلی پہلے تو اس کی چمک کو حیرانگی سے دیکھتا رہا پھر اس نے اپنی مخصوص زبان میں کچھ کہا تو ایک اور جنگلی جس کے سر پر پروں کا بنا تاج رکھا تھا، آگے بڑھا اور اس نے لاکٹ اٹھا لیا۔ یہ شخص انکا سردار نظر آتا تھا۔ وہ لاکٹ اس نے جوں کا توں اپنے گلے میں ڈال لیا اور خوشی سے ناچنے لگا۔

''خدا تمہارا بھلا کرے!'' عامر بڑبڑایا۔

اس کا مقصد حل ہو چکا تھا۔ گو کہ اب کیپٹن علی کو اس جگہ کی نشان دہی وہ کروا چکے تھے پھر بھی جب تک یہ لاکٹ اس جنگلی کے گلے میں موجود رہتا، ان کی نقل و حرکت کا علم کیپٹن علی کو ہوتا رہتا۔ دونوں صرف ایک بات پر مطمئن تھے کہ کم از کم ٹیپوان لوگوں کے ہاتھ نہیں لگا۔

نئے دیوتا کی آمد

جنگلی دونوں کو ہانکتے ہوئے اب جھونپڑیوں کے ایک کونے پر کالے پتھروں سے بنائی گئی ایک عمارت کے سامنے لے آئے تھے۔ انکی شکل دیکھتے ہی جھونپڑوں کے اور بھی بہت سے بچے اور عورتیں نکل آئے اور وہ سب اب مل کر ان کے گرد اگرد ایک دائرے کی شکل میں رقص کر رہے تھے۔ یوں دکھائی پڑتا تھا جیسے اپنی خوشی کا اظہار کر رہے ہوں۔ جیسے ہی کالے پتھروں کا دروازہ کھلا، وہاں سے لومبا برآمد ہوا۔

لومبا کی شکل پر نظر پڑتے ہی ان کے قدم تھم گئے اور وہ فوراً اپنی اپنی جگہ سجدہ ریز ہو گئے۔ لومبا نے ان کی زبان میں اونچی آواز میں کچھ کہا اور تمام جنگلی اپنے ہاتھ باندھے الٹے قدموں اپنی جھونپڑیوں کی طرف واپس لوٹنے لگے۔ اس کے ساتھ ہی عمارت کے دروازے سے دو انگریز نمودار ہوئے جنہوں نے ہاتھوں میں خودکار رائفلیں پکڑ رکھی تھیں۔

لومبا ایک طرف ہٹ گیا اور اس نے دونوں کو عمارت کے اندر داخل ہونے کا حکم دیا۔

''ہیلو بلیک ڈنکی!'' (کالے گدھے)۔ عامر نے اس کے قریب پہنچ کر اسے چڑایا۔

''شٹ اپ!'' لومبا چیخا۔

''ہائیں! آپ تو واقعی ناراض ہو گئے دیوتا صاحب! کیا آپ غصے کے دیوتا ہیں؟'' عامر نے اسے پھر چڑایا۔

''مسخرے تم نے بہت باتیں کر لیں۔ اب تم بولنے کے قابل ہی نہیں رہو گے۔''

''اسے اپنی قسمت سمجھو۔'' وہ غصے سے پھنکارا۔

''پامسٹری سے مجھے بھی بہت دلچسپی ہے مسٹر دیوتا اور میں ہاتھ کے بجائے ماتھے کی لکیر پڑھا کرتا ہوں۔ تمہارے ماتھے کی لکیر پڑھ کر میں نے تمہیں گدھا کہا تھا۔'' عامر اسے طیش دلانے پر تلا ہوا تھا۔

''زیادہ بک بک مت کرو!'' لومبا اتنے زور سے چیخا کہ اسے کھانسی آنے لگی تھی۔

''تمہاری حالت مجھے رحم آ رہا ہے لیکن کیا کر سکتا ہوں۔ ویسے اس مرتبہ ٹانگو نے قربانی کے بکرے کا انتخاب خوب کیا ہے''۔ عامر نے پھر اسے غصہ دلایا۔

''کاش باس نے تمہیں اپنے ہاتھوں سے مارنے کی قسم نہ کھائی ہوتی۔'' لومبا نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

''ہمارا مرنا جینا تو خدا کے ہاتھ میں ہے لیکن تمہاری موت بہت بھیانک ہو گی۔'' جنرل زاہدان نے گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا۔

انہوں نے دیکھ لیا تھا کہ عامر ان لوگوں کی ذہنی برتری قبول کرنے کے لیے ہرگز تیار نہیں۔ شاید وہ اس موقع سے فائدہ اٹھانے کے چکر میں تھا۔ لیکن لومبا نے بھی کچی گولیاں نہیں کھیلی تھیں۔

''اندر چلو''۔ اس نے انہیں حکم دیا۔ اس کے ہاتھ میں دو رائفلیں ان کی گردنوں سے لگ گئیں۔

عمارت اندر سے کافی کشادہ تھی۔ ایک طرف گھوڑوں کا اصطبل نظر آ رہا تھا جس میں جنگلی گھوڑے بندھے تھے۔ ان لوگوں نے انہیں ٹرینڈ کر رکھا تھا اور اب اپنے مقاصد کے لیے استعمال کر رہے تھے۔

انہیں عمارت کے اندر موجود ایک کمرے میں جس کے دروازے میں سلاخیں لگی تھیں، بند کر

دیا گیا۔ لوہے کی سلاخوں کا دروازہ انہوں نے اس جنگل میں پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔ کمرے کے سامنے دو پہرے دار موجود تھے۔ عامر نے انہیں اپنی طرف مخاطب کرنے کی بہتیری کوشش کی لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوئے۔ یوں دکھائی پڑتا تھا جیسے وہ گونگے اور بہرے ہوں۔

آج انہیں یہاں بند ہوئے دوسرا دن ہونے کو آیا تھا۔ اس دوران انہیں سلاخوں کے رستے سے کھانے کو دو وقت روٹی دے دی جاتی تھی۔ اس کمرے کے ایک کونے میں ٹائلٹ بنا تھا۔

دوسرے روز بھی وہ یہاں آنے والے نئے پہرے دار کو متوجہ کرنے کی کوشش میں لگا تھا لیکن وہ اس کی آواز پہ اس طرف متوجہ ہونے کو بھی تیار نہیں تھا۔

''ارے بھائی تم کیا بہرے ہو؟'' عامر نے زچ ہو کر اسے مخاطب کیا۔

''نہ صرف بہرا بلکہ اندھا بھی۔ یہ تمہاری طرف دیکھے گا بھی نہیں۔ ٹانگو کے جانثار اس کے ہر حکم کی تعمیل کرتے ہیں۔''

آواز اس کوکمرے کی طرف آنے والے راستے سے سنائی دی تھی۔ عامر نے گردن گھما کر اس طرف دیکھا اور حیران رہ گیا۔ وہاں بحری جہاز والا بوناموسس ڈی فرانسس کھڑا مسکرا رہا تھا۔ یہی ڈاکٹر ٹانگو تھا۔

''ہیلو مسٹر جوکر! یار بڑے زندہ دل آدمی ہو۔ ان وحشیوں کو بھی سرکس دکھا کر خوش کرنے کا انتظام کر رکھا ہے۔'' عامر نے سنبھل کر اپنا ہاتھ کھڑکی سے باہر نکالتے ہوئے کہا۔

''ہاں! لیکن آج رات یہ تمہارے کمالات سے لطف اندوز ہوں گے۔'' ٹانگو نے اس کے آگے بدلے ہوئے حالات کو نظر انداز کرتے ہوئے اسی لہجے میں دانت نکالتے ہوئے کہا۔

''بڑے بدتمیز ہو یار! اپنے پیشے میں کم از کم ایسے لوگ میں نے نہیں دیکھے۔'' عامر نے ہاتھ اندر کر لیا۔

''تم نے ابھی دیکھا ہی کیا ہے۔ آج رات کا تماشہ تو تم نے زندگی بھر دیکھا ہی نہیں ہوگا۔ لیکن افسوس اس کا آخری حصہ دیکھنے کے لیے تم زندہ نہیں رہو گے۔'' ٹانگو نے قہقہہ لگایا۔

''کیوں؟ اس کے بعد کیا تم اس قابل ہی نہیں رہو گے؟'' عامر نے حیرت سے کہا۔

''تم جیسے زندہ دل آدمی کا گوشت میرے آدم خور ساتھی بڑی رغبت سے کھائیں گے۔ انہوں نے بہت عرصے بعد کسی مہذب دنیا کے آدمی کو ذبح کر کے کھانا ہے۔'' ٹانگو بدستور چہک رہا تھا۔ ''آج کی رات جشن کی رات ہے۔ آج ان لوگوں نے اپنے دیوتا کے حضور دو مہذب انسانوں کی قربانی پیش کرنی ہے۔ آج یہ بہت خوش ہیں۔''

''اپنے ساتھ کیا اس کالے گدھے کی بھی چھٹی کروا دو گے۔'' عامر چہک کر بولا۔ ''تم نے تو مرنا ہی تھا۔ اس بے چارے بوڑھے کو اپنے ساتھ خوامخواہ مروا دیا۔''

ٹانگو اس کے طنز کو بالکل نظر انداز کر گیا۔ وہ بڑا منجھا ہوا کھلاڑی تھا۔ طیش میں آنا تو اس نے سیکھا ہی نہیں تھا۔

''میں نے سوچا تمہارے مرنے کا منظر اپنی آنکھوں سے دیکھ لوں۔ یوں بھی تمہاری موت کے لیے یہی جگہ زیادہ مناسب ہے۔ تم جیسے خونخوار کتوں کو مہذب دنیا میں موت بھی نہیں ملنی چاہیے۔'' جنرل زاہدان نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

عامر نے اس کی بات پر زوردار قہقہہ لگایا تو ٹانگو غصے سے اپنے ہونٹ کاٹ کر رہ گیا۔ اس نے اپنے چہرے کو فوراً ہی نارمل کر لیا۔

''اچھا دوستو، آخری ملاقات تک کے لیے خدا حافظ!'' کہہ کر وہ چلا گیا۔

''خدا کرے یہ ہماری آخری ملاقات ہی ثابت ہو۔'' عامر اور زاہدان نے ایک ساتھ ہی کہا اور دونوں مسکرا دیے۔

☆☆☆☆☆

ٹیپو نے درخت پر چڑھ کر اپنی دوربین سنبھال رکھی تھی کافی دور تک وہ ان پر نظریں جمائے رہا۔ پھر وہ لوگ درختوں کے گھنے سلسلے میں غائب ہو گئے تھے اس پر اس نے ٹرانسمیٹر پر کیپٹن علی سے رابطہ قائم کیا اور اگلی ہدایات طلب کیں۔

''تعاقب کی ضرورت نہیں۔ وہ جہاں بھی ہوں گے ہمیں معلوم ہو جائے گا۔ تم واپس آ جاؤ۔'' کیپٹن نے اسے ہدایت دی۔

ٹیپو نے اس سے پوچھا تھا کہ کیا وہ ان لوگوں کا تعاقب کرے لیکن جس مقصد کے لیے وہ تعاقب کرتا اس میں انہیں کامیابی ہو ہی چکی تھی۔

کیپٹن علی نے اسے واپسی کے لیے قطب نما پر مخصوص ڈگری بتا دی تھی جس پر اسے سفر کرنا تھا۔ جیسے ہی ٹیپو کا سفر کے دوران زاویہ بگڑنے لگتا وہ پھر اسی ڈگری پر گھوم جاتا۔ اس طرح سفر کرتے ہوئے وہ شام کے وقت گرجے پر پہنچ گیا جہاں کیپٹن علی اور ولیم بے چینی سے اس کے منتظر تھے۔

ان لوگوں نے یہاں ایک نیا منصوبہ تیار کر رکھا تھا۔ ٹیپو نے دیکھا شیر اب باڑے کے بجائے ولیم کے نزدیک ہی بیٹھا تھا جو اس کے سر پر ہاتھ پھیر رہا تھا۔ جب انہوں نے پادری کو یہ منصوبہ سمجھایا تو وہ عش عش کر اٹھا۔

شام ڈھلنے لگی تو ولیم نے شیر کو دوبارہ اس باڑے میں بند کر دیا۔ پھر وہ سب اچانک چونک پڑے۔ انہیں دور سے بہت سے قدموں اور چیخوں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ تینوں نے اسلحے کے ساتھ فوراً پوزیشن سنبھال لی۔ پادری بھاگم بھاگ اس راستے کی طرف جا رہا تھا جدھر سے یہ آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔ پھر اس نے ان لوگوں کو سختی سے گولی نہ چلانے کی ہدایت کی تھی۔

تین چار منٹ بعد پادری کی واپسی ہو گئی۔ اس کے چہرے سے خوشی کے آثار نمایاں تھے اور وہ دور ہی سے شور مچاتا آ رہا تھا۔

''شومبا آ گیا! شومبا آ گیا!''

تینوں نے سکون کا سانس لیا۔ تھوڑی دیر بعد ان کی نظر شومبا پر پڑی جو ایک گھوڑے پر سوار تھا۔ اس کے پیچھے جنگلی پیدل چلے آ رہے تھے۔ ان لوگوں نے درجنوں ہرن اور بھینسے شکار کر کے ڈنڈوں کے ساتھ باندھ رکھے تھے اور انہیں اٹھائے چلے آ رہے تھے۔ شومبا اپنے گھوڑے سے اتر کر نیچے آ گیا۔ اب وہ ان کے نزدیک پہنچ چکا تھا۔ اس نے بڑے مہذب انداز میں جھک کر ان لوگوں کو سلام کیا۔

پادری اس دوران ان کی زبان میں شومبا سے باتیں کرتا جا رہا تھا اور شومبا انکی طرف دیکھ کر

گردن ہلائے جا رہا تھا۔ اس کے چہرے سے خوشی جھلک رہی تھی۔ پادری نے پھر علی کو مخاطب کر کے بتایا کہ اس نے شومبا کو ساری سکیم سمجھا دی ہے۔ وہ تو فوراً ٹانگو پر حملہ کرنا چاہتا ہے لیکن میں نے کہا ہے کہ ابھی صبر کرو۔ علی نے شومبا کے لیے خصوصی ہدایات دیں۔ پھر ولیم کو اشارہ کیا تو وہ ایک خصوصی بیگ میں سے بندوق اٹھا لایا۔ یہ وہ بندوق تھی جس پر ان لوگوں نے پرتاب نگر میں قبضہ کیا تھا۔ ڈاکٹر دانگلے کی تیار کردہ ایسی چند بندوقیں خصوصی طور پر انہوں نے اسی مقصد کے لیے سنبھال رکھی تھیں اور ہوائی جہاز کے ذریعے مڈاشا پہنچا دی گئی تھیں۔ اب ایک بیگ میں یہ لوگ ایسی چند بندوقیں اپنے ساتھ لے آئے تھے۔ جب کیپٹن علی نے شومبا کو انکی تباہ کاریوں سے آگاہ کیا تو وہ خوشی سے ناچنے لگا۔

اس نے اپنی ایک بندوق شومبا کو دیتے ہوئے خاص طور سے ہدایت کی تھی کہ ضرورت کے بغیر ہرگز ہرگز اسے فائر نہ کرے کیونکہ انہیں اس کی قدم قدم پر ضرورت پیش آئے گی۔

اس رات وہ سکھ کی نیند سوتے رہے۔ اگلے روز علی الصبح شیر کو اپنے ہمراہ لے کر ولیم اور کیپٹن علی اور ٹیپو اگلی مہم پر چل دیے۔ شومبا نے اپنا گھوڑا بھی ان کے ساتھ کر دیا تھا۔

☆☆☆☆☆

''میں ذرا مرنے سے پہلے دو نفل شکرانے کے ادا کر لوں۔'' عامر نے اپنے نزدیک سر جھکائے بیٹھے جنرل زاہد ان کو مخاطب کیا۔

''وہ کیوں!'' انہوں نے چونکتے ہوئے پوچھا۔ وہ کسی گہری سوچ میں مبتلا تھے۔

''اس نوکری سے جان تو چھٹے گی۔ آج بادشاہ ہیں، کل فقیر۔ آج کسی کے قیدی ہیں، کل کسی کو قید کر رہے ہیں۔ اس سے تو بہتر تھا میں کہیں کدو بیچ رہا ہوتا۔'' عامر بولا۔

''یہ کدو کیا ہوتا ہے؟'' جنرل نے پوچھا۔

''بس ہوتا ہے۔ اس کے متعلق مجھے بھی آپ جتنا ہی علم ہے۔ ویسے ہونے کو تو کریلا بھی ہوتا ہے اور نیم چڑھا کریلا بھی ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ.....''

''کیا کہہ رہے ہو یار! میرے پلے تو کچھ نہیں پڑا۔'' جنرل زاہد ان نے اسے ٹوکتے ہوئے

کہا۔

''لیکن میرے پلے کچھ پڑ چکا ہے۔'' عامر نے کہا۔

''کیا؟''

''یہ''۔ کہتے ہوئے عامر نے ایک جنگلی کیڑا اپنے کپڑوں سے جھاڑ کر نیچے پھینک دیا۔

جنرل زاہدان نے زوردار قہقہہ لگا کر اسے داد دی۔

باہر ڈھول بجنے کی آوازیں بلند ہونے لگی تھیں۔ دونوں ذہنی طور پر خود کو آنے والے حالات سے مقابلہ کرنے کے لیے تیار کر رہے تھے۔ پھر انہوں نے مسلح محافظوں کو اپنے کمرے کی طرف آتے دیکھا۔

''اب بڑی جلدی آئے ہو۔ ہمارے بلانے پر تو دیکھتے ہی نہیں تھے ایسی ہی بات تو پہلے بتا دیتے۔ ہم بھی تالیاں پیٹ کر تمہیں بلا لیتے۔ کل سے کہہ رہے ہیں دروازہ کھولنے کے لیے۔'' عامر نے چڑانے کے انداز میں کہا۔

''ایک محافظ نے ان کے کمرے کا تالا کھول دیا تھا۔ باقی اندر گھس آئے اور انہیں دھکے مارنے لگے۔

''کیا کر رہے ہو میاں صاحبزادے! عقل کے ناخن لو۔ شرفاء سے اس طرح پیش نہیں آتے۔'' عامر نے اس کے سامنے ہاتھ نچاتے ہوئے کہا۔

''سیدھی طرح چلتے ہو ورنہ.....'' عامر نے دیکھا سامنے سے لومبا نمودار ہو رہا تھا۔

''اوہ ہو! بالآخر اس نے تمہیں مرنے کے لیے بھیج ہی دیا کالے گدھے۔'' عامر نے اسے چڑایا۔

''میرا خیال ہے تم اپنی زندگی مقررہ وقت سے بھی چند گھنٹے پہلے ختم کرنا چاہتے ہو۔''

لومبا بولا اور اسکے اشارے پر مسلح محافظ انہیں دھکے دیتے ہوئے باہر لے آئے۔

عمارت کے باہر جنگل کے لوگ زور زور سے ڈھول پیٹ رہے تھے۔ کچھ ان میں سے وحشیانہ انداز میں رقص کر رہے تھے۔ ان کی شکل پر نظر پڑتے ہی ان کے رقص میں اور زیادہ شدت

پیدا ہو گئی۔

''کیا کریں گے اب یہ ہمارا؟'' جنرل زاہدان نے عامر کی طرف دیکھا۔

''اچار ڈالیں گے۔ یہ انسانوں کا اچار بھی بڑی رغبت سے کھاتے ہیں بلکہ کئی آدم خوروں کا یہ من بھاتا کھاجا ہے''۔ عامر بولا تو جنرل زاہدان بے ساختہ ہنس دیے۔ وہ حیران تھے کہ عامر اس حالت پر بھی مذاق سے باز نہیں آ رہا۔

میدان کے چاروں طرف جنگلی ہاتھوں میں نیزے پکڑے موجود تھے اور وسط میں زمین میں لکڑیاں گاڑ کر دو ٹیٹر بنائے گئے تھے۔ وہ دونوں کو دھکے دیتے اس طرف لے جا رہے تھے۔ پھر دونوں کو ان کے ساتھ رسیوں سے باندھ دیا گیا۔

''کیا کر رہے ہیں یہ آخر! اگر ہمیں مارنا ہی ہے تو سیدھے طریقے سے مار ڈالیں۔'' جنرل زاہدان سے جھنجھلاہٹ کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

''جنرل صاحب! ابھی تو یہ ریہرسل فرما رہے ہیں۔ ماریں گے ذرا دیر سے۔'' عامر نے کہا جنرل بے ساختہ مسکرا دیا۔

''تم کس مٹی کے بنے ہو یار!'' انہوں نے تحسین آمیز نظروں سے عامر کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''گیلی مٹی سے۔ جب کہ میرے باس کا خیال ہے کہ میں چکنی مٹی سے بنا ہوں۔ وہ تو مجھے بار سے کبھی کبھی چکنا گھڑا بھی کہہ دیتے ہیں۔'' عامر بولے جا رہا تھا۔

''تم واقعی چکنے گھڑے ہو۔ تمام مصیبتیں اور دکھ تم پر سے پھسل کر گزر جاتے ہیں۔'' جنرل صاحب نے اسے داد دی۔

ارے نہیں صاحب! ایسی بھی کیا بات ہے۔'' عامر نے شرمانے کی اداکاری کی۔

ان کے گرد آگ کے الاؤ روشن کیے جا رہے تھے۔ لومبا جو ابھی تک عمارت کے اندر ہی تھا، جب نمودار ہوا تو اس نے ایک لمبا سا چوغہ پہن رکھا تھا اور ایک ہاتھ میں انسانی ہڈی اور دوسرے میں کھوپڑی پکڑے ہی وہ حسب سابق سجدے میں گر گئے۔

''پجاریو! آج ہمیں اپنے عظیم دیوتا ٹانگو کے حضور قربانی پیش کرنی ہے۔ عظیم ٹانگو ہم سے قربانی مانگ رہا ہے۔ آؤ اور عظیم دیوتا کی فتح کا جشن مناؤ۔'' لومبا نے چیخ کر کہا تو وہ لوگ زور زور سے چلاتے ہوئے اس کے گرد دائرے کی شکل میں رقص کرنے لگے۔

اس کے ساتھ ہی لاؤڈ سپیکروں کی گڑگڑاہٹ ہوئی اور ان کا رقص تھم گیا۔ بالکل اسی انداز میں جیسے ولیم اور علی نے دیکھا تھا۔ میدان کے ایک کونے سے ٹانگو کی کرسی برآمد ہوئی۔ ان کم بختوں نے یہاں بھی ایسا بندوبست کر رکھا تھا۔ جانے وہ کہاں کہاں سے اس کرسی کو برآمد کر لیتے تھے۔ اس کے ساتھ ہی تمام وحشی سر جھکا کر اپنی اپنی جگہ جم کر کھڑے ہو گئے۔

''پجاریو! ہمارا عظیم دیوتا ٹانگو آ گیا ہے۔ آگے بڑھو اور انہیں اپنے عظیم ٹانگو کے قدموں میں ذبح کر ڈالو''۔ لومبا نے چلا کر انہیں حکم دیا۔

ڈھول پھر اور زور زور سے بجنے لگے اور وہ وحشیانہ رقص کرتے ان کی طرف بڑھے۔

☆☆☆☆☆

ابھی بمشکل جنگلی دو تین قدم ہی نزدیک آئے تھے کہ فضا اچانک زوردار دھماکوں سے لرزنے لگی۔ سب لوگ حیران رہ گئے۔ ان کے سروں پر رنگ برنگ کے گولے پھٹ رہے تھے۔ لومبا سمیت سب حیرانگی سے آسمان کی طرف دیکھنے لگے۔ اس کے ساتھ ہی میدان کے ایک کونے سے ایک دیوتا شیر پر سوار نمودار ہوا جس نے ہاتھ میں ایک عجیب و غریب قسم کا ہتھیار تھاما ہوا تھا۔ یہ ولیم تھا۔

اس کے آگے آگے ایک سیاہ رنگ کے گھوڑے پر ایک اور دیوتا سوار تھا۔ جس نے اسی وضع قطع کا ہتھیار پکڑ رکھا تھا۔ اس کے کندھے پر ایک چھوٹا دیوتا تلوار تھامے بیٹھا تھا۔ یہ کیپٹن علی اور ٹیپو تھے۔

''پکڑ لو انہیں۔ مار ڈالو!'' لومبا نے چیخ کر انہیں حکم دیا۔

''گدھے! یہ تمہارا حکم نہیں مانیں گے کیونکہ ان کے بڑے بوڑھے انہیں بتا گئے تھے کہ سب سے طاقتور دیوتا اسی طرح اور اسی حلیے میں آئے گا۔'' کیپٹن علی نے اس سے کہا۔

اس اثناء میں ننھا دیوتا ٹیپو چھلانگ لگا کر دونوں قیدیوں کے نزدیک پہنچ چکا تھا۔ اس نے جھپکتے میں تیز دھار تلوار سے دونوں کی رسیاں کاٹ ڈالی تھیں۔ جنگلی جو نئے دیوتاؤں کی آمد کے ساتھ ہی ایک مرتبہ پھر سجدہ ریز ہو گئے تھے، ولیم کی آواز پر اٹھ کھڑے ہوئے۔ اس نے ان لوگوں کی زبان میں چلا کر جنگلیوں کو لومبا پر حملے کا حکم دیا تھا۔

جنگلی دیوانہ وار لومبا کی طرف بڑھے جو عمارت کی طرف بھاگتا چلا جا رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی عمارت سے جنگلیوں پر گولیاں برسنے لگیں لیکن اپنے دیوتا کے حکم کی تعمیل میں وہ جانوں کا نذرانہ دیتے رہے اور بمشکل دس منٹ کی لڑائی میں انہوں نے لومبا سمیت اس کے تمام ساتھیوں کو مار ڈالا۔ کیپٹن علی نے بڑی پھرتی سے ٹانگو پر گرنیڈ پھینکا تھا لیکن ٹانگو کو جیسے زمین نے نگل لیا ہو۔ جھپکتے وہ غائب ہو چکا تھا۔

جنگلی جب لومبا اور اس کے ساتھیوں کا خاتمہ کر کے واپس لوٹے تو ان کے دیوتا وہاں سے غائب ہو چکے تھے۔ کیونکہ وہ لوگ لومبا کے گھوڑوں پر سوار گرجے کی طرف بھاگ نکلے تھے۔ وہاں کا بپھرا ہوا شیر موجود تھا۔ یہ وہی شیر تھا جس پر ولیم دیوتا بن کر بیٹھا ہوا تھا اور جو اب بالکل بے قابو ہو چکا تھا۔ جنگلی اس سے نمٹنے لگے۔ اس دوران دیوتاؤں اور قیدیوں کو بھاگ نکلنے کا موقع مل گیا۔

دو دو ہاتھ

شومبا اور پادری دونوں بے چینی سے ان کے منتظر تھے۔ کیپٹن علی نے یہاں پہنچ کر انہیں ساری روداد سنائی تو شومبا نے کہا۔

''اب ہمیں ایک لمحہ ضائع کیے بغیر ٹانگو کی خفیہ پناہ گاہ پر حملہ کر دینا چاہیے ورنہ وہ اپنی ایٹمی ایجادات کے بل بولتے پر ہمیں تباہ کر ڈالے گا۔ جھنجھلاہٹ اور غصے میں وہ کوئی بھی حرکت کر سکتا ہے۔''

''لیکن ہمیں اس کے ٹھکانے کا علم تو ہے نہیں۔ اس کے بغیر کیسے.....؟''

''مجھے علم ہے۔'' شومبا نے علی کی بات کاٹ کر کہا۔ اس نے علی کو یہاں موجود ایک جگہ کی چند نشانیاں بتائیں تو ولیم نے فوراً کہہ دیا۔ ''بالکل ٹھیک! یہی ہے اس کا ہیڈ کوارٹر۔''

ولیم نے شومبا کی طرف سے بنائی گہرے رنگ کی عمارت کی نشانیوں سے اسے پہچانا تھا۔ عمارت ایک ندی کے کنارے واقع تھی۔ سب لوگ اب شومبا کی کمان میں اس طرف بڑھ رہے تھے۔ اس نے اپنے قبیلے کے پندرہ بیس جنگلیوں کو اپنے ساتھ لے لیا تھا۔ وہ سب لوگ گھوڑوں پر سوار تھے۔

کیپٹن علی اور اس کے ساتھی بھی ان کے پیچھے پیچھے جا رہے تھے۔ شومبا انہیں بڑے ٹیڑھے راستوں سے لیے جا رہا تھا اس لیے سب کو بار بار سنبھلنا پڑتا تھا۔ تقریباً ایک گھنٹہ اسی طرح گزر گیا۔ اب وہ ایک قدرے کھلے علاقے میں تھے جب اچانک آسمان سے آگ برسنے لگی۔ کیپٹن علی نے دیکھ لیا تھا یہ آگ ایک مخصوص زاویے میں گر رہی ہے۔ اس نے چلا کر شومبا اور اس کے ساتھیوں کو ہدایت کی کہ وہ اس زاویے سے ہٹ کر چلیں۔ اس اثناء میں تین جنگلی آگ میں جھلس چکے تھے اور شومبا کا غصہ آسمان کو چھو رہا تھا۔ وہ دیوانہ وار ندی کی طرف گھوڑے بھگا رہے تھے۔

اب انہیں ندی کے ایک کنارے پر ایک پتھروں سے بنی عمارت نظر آنے لگی۔ یہ ایسی عمارت تھی جیسی انہوں نے لومبا کے ٹھکانے پر کل دیکھی تھی۔

اچانک ان پر عمارت سے فائرنگ ہونے لگی۔ فائرنگ اسی طرح کے خطرناک اسلحے سے ہو رہی تھی جو کیپٹن علی اور اس کے ساتھیوں کے پاس موجود تھا۔ انہوں نے بھی جواباً اسی اسلحے سے مقابلہ شروع کر دیا۔ شومبا زور زور سے چلا کر اپنے ساتھیوں کو احکامات دے رہا تھا اور اس کے جنگلی ساتھی ہاتھوں میں نیزے تھامے عمارت کی طرف بڑھ رہے تھے۔ اب عمارت میں آگ لگ گئی تھی۔

اس اثناء میں کیپٹن علی نے اچانک ایک سفید رنگ کے گھوڑے پر ٹانگو کو عمارت کی بائیں طرف سے فرار ہوتے دیکھ لیا تھا۔ وہ فوراً اس کے تعاقب میں لپکا لیکن اس سے پہلے جنرل زاہدان اس پہاڑی ٹیلے پر پہنچ چکا تھا جس کے نیچے سے ٹانگو کے گھوڑے نے گزرنا تھا۔

جیسے ہی اس کا گھوڑا ٹیلے کے نیچے آیا، جنرل زاہدان نے اس پر چھلانگ لگائی اور ٹانگو سمیت گھوڑے سے دور جا گرا۔

ٹانگو کی آنکھوں میں خون اتر آیا تھا۔ اس نے اپنا خنجر نکالا اور جھپٹ کر جنرل زاہدان پر حملہ آور ہوا۔ بمشکل جنرل نے اس حملے سے خود کو بچایا لیکن اس کا ایک بازو پھر بھی زخمی ہو گیا تھا۔ وہ اپنا ہاتھ تھام کر ایک طرف جھک گئے۔

ٹانگو خنجر تان کر ان کی طرف بڑھا لیکن اچانک اپنے سینے پر لگنے والی زوردار ٹانگ نے اسے

الٹا کر رکھ دیا۔ کیپٹن علی نے جو یہاں پہنچ چکا تھا، اپنے گھوڑے سے سیدھے اس پر چھلانگ لگائی تھی اور پہلو کے بل اس کے سینے پر لات ماری تھی۔ اگر وہ حملے پر ایک لمحے کی بھی تاخیر کرتا تو شاید جنرل زاہدان کی جان چلی جاتی۔

ٹانگو گرا ضرور لیکن یوں لگتا تھا گویا وہ ربڑ کا انسان ہے۔ وہ انہی قدموں پر اچھلا اور علی پر حملہ آور ہوا لیکن علی نے اس کے خنجر والے ہاتھ کو پکڑ کر اتنا زوردار جھٹکا دیا تھا کہ خنجر اس کے ہاتھ سے نکل کر دور جا گرا جو جنرل زاہدان نے اٹھا لیا تھا۔

ٹانگو تلملا کر واپس پلٹا۔ اس دوران جنرل زاہدان غصے سے کھولتے اس پر خنجر کے ساتھ حملے کے لیے پر تول رہے تھے لیکن علی نے چیخ کر انہیں منع کر دیا۔

''نہیں جنرل! اسے میرے ساتھ دو دو ہاتھ کرنے کی بڑی خواہش تھی۔ موت سے پہلے اس کی یہ حسرت بھی پوری ہو جانی چاہیے۔'' علی نے کچھ ایسے لہجے میں کہا کہ جنرل اپنی جگہ پر جم کر رہ گیا۔

ایک طرف علی اور اس کے ساتھی ٹانگو کے ساتھیوں سے جنگ لڑ رہے تھے اور ادھر ان دونوں کے درمیان معرکہ جاری تھا۔ جنرل زاہدان نے بڑی حیرت سے ان دونوں کو لڑتے دیکھا۔ قریباً آٹھ دس منٹ تک وہ ایکدوسرے پر خطرناک داؤ لگاتے رہے۔ پھر اچانک ٹانگو فضا میں آ اچھل کر اس پر حملہ آور ہوا لیکن اس دوران جنرل نے دیکھا کہ علی نے بھی فضا میں اپنی دونوں ٹانگیں ایسی قوت سے ٹانگو کو رسید کی تھیں کہ پھر اسے زمین سے دوبارہ اٹھنا نصیب نہ ہوا۔ اب وہ ایک کینچوے کی طرح وہاں گرا ہوا تھا۔

اس دوران دوسری طرف بھی مزاحمت ختم ہو چکی تھی۔ ٹانگو کے قریباً سبھی ساتھی مارے گئے تھے۔ تین گرفتار ہو چکے تھے۔ ان کے اردگرد دور دور تک آگ پھیلی ہوئی تھی۔

علی نے ٹانگو کو رسوں کی مدد سے ایک گھوڑے کی پیٹھ پر باندھ دیا تھا اور وہ اس گھوڑے کی لگام اپنے گھوڑے سے باندھے اب گرجے کی طرف جا رہے تھے۔ جب اچانک بندھے ہوئے ٹانگو کا قہقہہ بلند ہوا:

''کیپٹن علی! تم کبھی ٹانگو کی ایجاد پر قبضہ نہیں کر سکتے۔ دنیا کی کوئی طاقت نہیں کر سکتی۔'' اس کا نہ گونجا۔

اس کے ساتھ ہی زوردار دھماکہ ہوا۔ انہوں نے گردن گھما کر دیکھا۔ وہی عمارت بھک سے اڑ گئی تھی اس کے بعد تو دھماکوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ سب لوگ دیوانہ وار اپنے گھوڑے بھگا رہے تھے۔ علی نے اس بات کا خاص خیال رکھا تھا کہ اس افراتفری سے فائدہ اٹھا کر ٹانگو ہرگز بھاگنے نہ پائے۔

بمشکل وہ گرجے تک پہنچے۔ اب وہ بالکل محفوظ تھے۔ شومبا اور اس کے قبیلے کے لوگ انہیں کی حفاظت میں جنگل کے آخری سرے تک چھوڑنے آئے تھے۔ راستے میں جہاں کہیں جنگلیوں نے ان پر حملہ کیا، شومبا اور اس کے ساتھیوں نے انہیں بھاگنے پر مجبور کر دیا۔ جنگل کے خاتمے سے پہلے ہی وہ لوگ رخصت ہو گئے۔ پادری بھی ان کے ساتھ ہی لوٹ گیا تھا۔

جنگل کے آغاز پر مڈاشا کی فوج کے جوان ان کے استقبال کے لیے موجود تھے۔ ٹانگو کی گرفتاری اور اس کے ہیڈ کوارٹر کی تباہی کی خبریں ساری دنیا میں پھیل چکی تھیں۔ اور دنیا بھر سے اخبار نویس مڈاشا میں آئے ہوئے تھے لیکن علی کی خصوصی ہدایت پر انہیں بہت دور رکھا گیا تھا۔ یوں سے بندھے ٹانگو کو انہوں نے فوج کے حوالے کے دیا۔ ٹانگو کو دیکھ کر کسی کو یقین نہیں آتا تھا کہ یہی دنیا کا وہ خطرناک ترین مجرم ہے جس کے ہاتھوں بڑی بڑی حکومتیں تنگ آ گئی تھیں۔ تین دن تک انہیں مڈاشا کی حکومت نے زبردستی مہمان رکھا۔ پھر وہ وعدے کے مطابق رپورٹ سعید ل کرنل رفیق کے پاس تین روز تک مہمان رہنے کے بعد اپنے ملک میں چلے آئے۔

☆☆☆☆☆

کیپٹن علی اور اس کے ساتھی جس ہوائی جہاز میں یہاں پہنچے تھے اس کا استقبال کرنے ملک کے اعلیٰ افسر نے وہاں ٹیلی گرام کیپٹن علی کو دے دیا۔ یہ ابھی ابھی کیپٹن علی کے نام موصول ہوا تھا۔ لی نے وہیں لفافہ پھاڑ کر ٹیلی گرام نکال کر پڑھا اور مسکرا دیا۔

''خیریت؟'' عامر نے استفسار کیا۔

''ٹانگو بھاگ نکلا اور اس نے یہ ٹیلی گرام مجھے ارسال کیا ہے۔ تم بھی پڑھ لو۔'' عامر نے ٹیلی گرام پکڑ کر اس پر نظریں دوڑائیں۔ لکھا تھا:

''کیپٹن علی! تم نے میرا ہیڈ کوارٹر تباہ کر دیا۔ میرے تمام اہم ساتھیوں کو ایک ایک کر کے ختم کر دیا۔ میرا ایجاد کردہ خطرناک کیمیکل کا ذخیرہ تباہ ہو گیا۔ اب میری زندگی کا ایک ہی مقصد رہ گیا ہے کہ تمہیں ختم کر دوں۔ میں اپنا انتقام ضرور لوں گا۔

خواہ مجھے جان سے ہاتھ کیوں نے دھونے پڑیں۔''

ایک لحاظ سے تو اچھا ہی ہو گیا۔'' عامر بولا۔

''کیوں؟''

''میرا مقابلہ ابھی موصوف سے باقی ہے۔''

اور قہقہہ لگا کر ہنس دیا لیکن آنے والے خدشات کا احساس انہیں بڑی شدت سے ہو رہا تھا۔

سازش

تعاقب شیطان کی آنت کی طرح لمبا ہی ہوتا جا رہا تھا۔ عامر دل ہی دل میں اسے کوس رہا تھا۔ جس نے اب تک اسے آٹھ دس میل کی پیدل سیر کروا دی تھی۔ کبھی وہ کسی کریانے کی دکان میں گھس کر آٹے دال کا بھاؤ دریافت کرنے لگتا' کبھی کسی میڈیکل سٹور پر کھڑے ہو کر ادویات کا رونا شروع کر دیتا اور کبھی کسی بک سٹال پر رک کر اخبارات کی سرخیاں پڑھنے لگتا۔

عامر کو تو ابھی تک یہ بھی سمجھ نہیں آئی تھی کہ پچھلے تین روز سے آخر وہ اس کا مسلسل تعاقب کیوں کر رہا ہے۔ کیپٹن علی نے اسے سختی سے ہدایت کی تھی کہ اس شخص کو اپنی نظروں سے اوجھل نہ ہونے دے اور اس کے پل پل کی خبر رکھے۔ جب وہ کسی سنیک بار میں داخل ہوتا تو عامر باہر دروازے پر اس کا انتظار کرنے لگتا۔

آج ٹیپو بھی اس مہم میں شامل ہو گیا تھا۔ اس وقت بھی وہ شخص ایک سنیک بار میں گھسا مشروبات سے لطف اندوز ہو رہا تھا اور عامر دروازے کے سامنے کھڑا اپنی قسمت کو کوس رہا تھا۔ اس سے کچھ فاصلے پر سکول کے طالب علموں کو یونیفارم پہنے ٹیپو بھی موجود تھا۔

دونوں بظاہر ایک دوسرے سے لاتعلق ہی رہا کرتے تھے۔ عامر اس سنیک بار کے بالکل

سامنے ایک سڑک کے کنارے ایک بک سٹال پر کھڑا ایک رسالے کی ورق گردانی کر رہا تھا۔

''نہ جانے اس گدھے میں کیا خوبی ہے جو ہم دونوں اس کے پیچھے جھک مار رہے ہیں۔''

عامر نے دل ہی دل میں کہا۔

اب وہ شہر سے باہر آ کر چوتھی شاہراہ کی جانب گھوم گیا تھا اور ایک بک سٹال پر کھڑا ہو کر وہی اخبار پڑھنے لگا جو اس سے پہلے چار مرتبہ وہ دوسرے بک سٹالوں پر پڑھ چکا تھا۔ عامر جو ایک کونے میں اپنے منہ کے سامنے انگریزی رسالہ پھیلائے اس کی ورق گردانی کر رہا تھا اس کی اس حرکت سے بھنا گیا۔ ٹیپو کچھ فاصلے پر کھڑا چیونگم چبا رہا تھا۔ کبھی کبھی وہ عامر کو چڑانے کیلئے اس کی طرف دیکھ کر مسکرا دیتا۔

''گدھا کہیں کا!'' عامر بڑبڑایا۔

''کیا مطلب ہے مسٹر؟ ہوش تو ٹھکانے ہیں آپ کے۔''

اس کے ساتھ کھڑے ایک پروفیسر نما بوڑھے نے جس کی طوطے جیسی لمبی ناک پر موٹے شیشوں کی عینک جمی تھی کہا۔ اس نے اتفاق سے عامر کی بڑبڑاہٹ سن لی تھی۔

''کیا فرمایا آپ نے؟'' عامر نے اس کی طرف جھکتے ہوئے کہا۔

''ابھی آپ نے کہا تھا؟'' بوڑھے نے غصے سے عینک کے شیشوں میں سے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

''گدھا کہیں کا!'' عامر نے جواب دیا۔

''لیکن کسے؟'' بوڑھے نے گلا پھاڑتے ہوئے کہا۔

''گدھے کو۔'' عامر کی سنجیدگی برقرار تھی۔

''اے مسٹر! تم ہوش میں ہو یا نہیں؟'' بوڑھے نے کھا جانے کے انداز میں سے گھورتے ہوئے پوچھا۔

''میں بقائمی ہوش و حواس ہوں بڑے میاں!'' عامر نے اسے چڑایا۔

وہ صبح سے اب تک کی مسلسل بھاگ دوڑ سے تنگ آ گیا تھا اور اب مشکل سے یہ کھلونا دل

ہلانے کو اس کے ہاتھ لگا تھا۔

''تم پاگل تو نہیں ہو!'' بوڑھے نے اتنی زور سے کہا کہ اسے کھانسی آ گئی۔

''آپ کا تعلق کیا.....'' عامر نے فقرہ ادھورا ہی چھوڑ دیا کیونکہ بوڑھے نے اپنے ہاتھ میں پکڑی چھڑی گھما دی تھی۔ یہ الگ بات تھی کہ عامر کے بجائے اس کے پیچھے کھڑے ایک اور شخص کے کندھے میں لگی جو اپنے کندھے پر ہاتھ رکھے ان دونوں کو کھا جانے والی نظروں سے گھور رہا تھا اور عامر اپنی جگہ کھڑا بدستور مسکرا رہا تھا۔

اس کے بعد تو جیسے بوڑھے پر پاگل پن کا دورہ پڑ گیا ہو۔ وہ چھڑی گھماتا ہوا عامر کی طرف لپکا۔ عامر آگے آگے تھا اور بوڑھا اس کے پیچھے پیچھے۔ وہاں موجود باقی تمام لوگ دونوں کی بھاگ دوڑ سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ بالآخر بوڑھا دوڑتا دوڑتا تھک کر ہانپنے لگا اور وہیں بیٹھ گیا۔

عامر نے اب جو بک سٹال کی طرف نظر ڈالی تو زمین اس کو اپنے قدموں تلے سرکتی محسوس ہوئی۔ کیونکہ وہ شخص وہاں سے غائب تھا جس کیلئے وہ پچھلے تین روز سے خاک چھان رہا تھا۔ جب اس نے فٹ پاتھ کی طرف دیکھا تو مطمئن ہو گیا۔ ٹیپو وہاں موجود نہ تھا۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ اپنے شکار سے ابھی تک چمٹا ہوا ہے۔

عامر نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا۔ اب اسے بوڑھے کے دو تین حمایتیوں سمیت بہت سے لوگوں نے گھیرے میں لے رکھا تھا۔ تمام لوگ اس سے بحث کر رہے تھے اور وہ باری باری سب کو مطمئن کر رہا تھا کہ بزرگوار کو غلط فہمی ہو گئی تھی۔ لیکن بوڑھے کے حمایتی خاصے پرجوش دکھائی دے رہے تھے۔

ایک نوجوان نے آگے بڑھ کر اس کا گریبان پکڑ لیا۔ اس کے دیکھا دیکھی دوسروں کی انسانیت بھی جاگی اور دو اور نوجوان اسکی طرف بڑھے۔ یہ الگ بات تھی کہ جس کو ایک ہاتھ عامر کا لگ جاتا وہ دوبارہ اس کی طرف کبھی بڑھنے کی جرات نہ کرتا۔

اچانک ہی عامر کے ذہن نے چیخ کر کہا۔ ''سازش! سازش.....!''

اس نے برق رفتاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے وہاں سے نکل جانا چاہا۔ ابھی عامر بمشکل چند

قدم ہی بھگا تھا کہ ''شائیں'' کی آواز پیدا کرتی ایک گولی اس کے کان کے نزدیک سے گزر گئی۔ اس نے اندازہ لگا لیا کہ فائر سائلنسر لگے ریوالور سے اور کہیں نزدیک ہی سے کیا گیا ہے۔ لیکن ابھی وہ اس پوزیشن میں نہیں تھا کہ حملہ آور کو تلاش کر سکتا۔ اتنے بڑے ہجوم میں جانے کس نے گولی چلائی تھی۔ اس نے فی الوقت اپنی جان بچانے میں عافیت سمجھی۔

عامر کا رخ اب بازار کے نزدیکی کار پارک کی طرف تھا۔ کار پارک تک وہ مختلف دکانوں کی آڑ لیتا ہوا پہنچا تھا۔ کار پارک میں پہنچتے ہی اس کے نزدیک دو گولیاں مختلف کاروں سے ٹکرائیں۔ عامر نے جان بوجھ کر ادھر کا رخ کیا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس پر چلائی گولی کسی بے گناہ کی جان لے لے۔

عامر بڑی پھرتی کا مظاہرہ کرتا ہوا مختلف کاروں کی آڑ میں کبھی آگے کبھی پیچھے' کبھی دائیں اور کبھی بائیں طرف جھکائی دے کر بالآخر وہاں سے نکلنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ اس کا رخ اب ایک دوسری مارکیٹ کی طرف تھا۔ جہاں ایک پبلک کال آفس سے اس نے کیپٹن علی کو فون کر کے تازہ صورتحال کی اطلاع دی۔

کیپٹن علی سمجھ گیا کہ عامر سازش کا شکار ہوا ہے۔ اس نے چند لمحے سوچنے کے بعد کہا۔

''ٹھیک ہے! گھر آنے کی ضرورت نہیں۔ ٹھکانہ نمبر سات پر پہنچ جاؤ۔ میں بھی وہیں آ رہا ہوں۔''

اس کے ساتھ ہی سلسلہ منقطع ہو گیا۔ عامر ٹھکانہ نمبر سات کی طرف جا رہا تھا۔

☆☆☆☆☆

اس شخص نے اپنی دانست میں بڑی پھرتی دکھائی تھی اور عامر کو بوڑھے کے ساتھ الجھا دیکھ کر وہاں سے کھسک گیا۔ یہ الگ بات تھی کہ ٹیپو نے اسے نظر انداز نہیں کیا تھا۔ وہ بڑے نپے تلے قدموں سے ہوشیاری کے ساتھ اس ہجوم میں اس کا تعاقب کر رہا تھا۔

دونوں اب ساتویں شاہراہ پر آ گئے تھے۔ اس شاہراہ پر ایک بڑی بلڈنگ کے سامنے وہ رک گیا۔ اب وہ بلڈنگ کی سیڑھیاں چڑھنے لگا تھا۔ یہاں سینکڑوں لوگوں کا آنا جانا لگا رہتا تھا اس

لئے ٹیپو کا اندازہ یہی تھا کہ وہ کسی کی نظروں میں نہیں آئے گا۔

ایک منزل چڑھ کر وہ شخص لفٹوں کے سامنے رک گیا۔ جیسے ہی ایک لفٹ رکی' وہ پھرتی سے اس میں داخل ہو گیا۔ ٹیپو سیڑھیوں کے کونے پر کھڑا تھا۔ اس نے چاہا پھرتی سے دوسری لفٹ میں داخل ہو جائے جو منزل پر آ رہی تھی۔ جیسے ہی اس کے قدم لفٹ کی طرف بڑھے' لفٹ کا دروازہ کھلا اور اس نے دیکھا' اس لفٹ میں صرف آپریٹر موجود تھا جس کے ہاتھ میں بچوں کے کھیلنے والے کھلونے سے مشابہت رکھتا ایک پستول پکڑا ہوا تھا جس کے منہ پر ننھا سا تیر لگا تھا اور اس کا رخ ٹیپو کی طرف تھا۔

''سازش.....!'' ٹیپو کا ذہن چلایا۔

اس نے الٹے قدموں خود کو سیڑھیوں پر گرا دیا۔ اب وہ کسی فٹ بال کی طرح سیڑھیوں پر لڑھکتا نیچے آ رہا تھا۔ لفٹ اوپر واپس چلی گئی تھی۔ یہ سب کچھ محض چند سیکنڈ میں انجام پا گیا۔

سیڑھیوں کے خاتمے پر ٹیپو رک گیا۔ اس کو گرنے سے خاصی چوٹ آئی تھی لیکن جان کے بچ جانے کے مقابلے میں یہ تکلیف کوئی اہمیت نہیں رکھتی تھی۔ وہ اٹھ کر پھرتی سے کھڑا ہو گیا۔

''کیا ہوا؟''

''کیا بات ہے؟''

''کیسے گر پڑے؟''

اس کے گرد لوگوں کا ہجوم اکٹھا ہو گیا۔ لیکن ٹیپو بظاہر مسکراتا ہوا ان کی طرف دیکھتا رہا۔

''کچھ نہیں۔ ذرا میرا پاؤں پھسل گیا تھا۔'' کہہ کر وہ لنگڑاتا ہوا ایک طرف چل دیا۔

تھوڑی دیر بعد ہی وہ ایک رکشہ پر بیٹھ کر ایک خفیہ ٹھکانے کی طرف جا رہا تھا۔

☆☆☆☆☆

کیپٹن علی اور دونوں اس وقت ایک خفیہ ٹھکانے پر موجود تھے۔ ایک ڈاکٹر علی کے ساتھ ہی وہاں آ گیا تھا۔ جس نے ٹیپو کو ایک انجکشن لگا کر کچھ گولیاں کھانے کے لئے دی تھیں۔ جس کے بعد وہ قدرے افاقہ محسوس کر رہا تھا ورنہ تو اسے اپنا بدن ٹوٹتا نظر آ رہا تھا۔

دونوں نے باری باری اسے اپنی کہانی سنادی تھی۔ عامر تو اس بات پر افسوس کا اظہار کر رہا تھا کہ وہ خوامخواہ اس بوڑھے سے الجھ کر اپنا شکار بھی ہاتھ سے کھو بیٹھا اور ٹیپو کو بھی بڑے خطرے سے دوچار ہونا پڑا۔

''ایسی بات نہیں۔ وہ بوڑھا جان بوجھ کر تم سے الجھا تھا۔ تم دونوں ایک گہری سازش کا شکار ہوئے ہو اور خدا کا شکر ہے کہ تمہاری جان بچ گئی۔ فی الحال تمہیں یہیں قیام کرنا پڑے گا۔ میں دیکھوں گا کہ اس سازش کی کڑیاں آخر کہاں کہاں ملی ہوئی ہیں۔'' کیپٹن علی نے سنجیدگی سے کہا۔

''اس ساری بھاگ دوڑ میں آپ نے ایک یہی کام کی بات کی ہے۔ چلو اب کچھ دیر آرام کرنے کا موقع تو ملے گا۔'' عامر نے خود کو ایک آرام دہ صوفے پر ڈھیر کرتے ہوئے کہا۔

''آرام کا تو نام ہی ذہن سے نکال دو۔'' کیپٹن علی کی سنجیدگی برقرار تھی۔

''آپ تو ہمیشہ یہی کہتے ہیں۔'' عامر بولا۔

''نہیں عامر! اس مرتبہ مقابلہ ٹانگو سے آن پڑا ہے۔''

''کیا مطلب!'' عامر نے چونکتے ہوئے پوچھا۔

''اوہ تو یہ وہی ذات شریف ہیں۔'' ٹیپو بولا۔

''جی ہاں اور جس کا آپ دونوں تعاقب کر رہے تھے اسے جانتے ہو؟''

''نہیں!''

وہ ہمارے شہر کا بہت بڑا سمگلر راجہ تھا جس کی تصویر دیکھتے ہی ولیم نے اس پر شک کا اظہار کیا تھا۔ اس کا کہنا ہے کہ یہ شخص اکثر سرکس میں مارٹن سے ملنے آیا کرتا تھا۔

''اچھا ٹانگو صاحب! اس مرتبہ تو آپ ٹانگوں پر چل کر واپس جانے سے رہے۔'' عامر بولا۔

ڈاکٹر جا چکا تھا۔ کیپٹن علی نے انہیں آنے والے حالات کے متعلق کچھ سمجھایا۔ پھر وہیں رہنے کی تلقین کرتا واپس آ گیا۔ راستے میں اس کے ذہن میں بہت سی باتیں گڈمڈ ہو رہی تھیں۔

وارنٹ گرفتاری

موقعہ واردات پر پولیس کے ساتھ ہی ایس پی بخاری بھی چلا آیا تھا۔ بوڑھے پروفیسر کو اس نے نزدیک ہی بٹھا رکھا تھا جو اسے ساری واردات کی تفصیلات سے آگاہ کر رہا تھا۔ اس کے علاوہ وہاں موجود باقی تمام لوگوں نے بھی اس نوجوان کو اس قتل کا ذمہ دار قرار دیا جو وہاں سے بھاگ گیا تھا۔

بخاری سے کچھ فاصلے پر اس راہ گیر کی لاش پڑی تھی جس کی کنپٹی میں گولی لگی تھی اور وہ لوگوں کے سامنے تڑپ تڑپ کر مر گیا تھا۔ بے چارا مرنے سے پہلے کوئی بھی ایسا بیان نہ دے سکا جس سے پولیس کو کچھ رہنمائی مل جاتی۔ پولیس کا فوٹو گرافر لاش کی تصویریں لے رہا تھا۔ پھر ماہرین نے کچھ نشانات حاصل کئے اور لاش پوسٹ مارٹم کے لیے روانہ کر دی گئی۔

یہ واردات بڑی افسوس ناک تھی لیکن بخاری کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا جب اس بوڑھے نے جس نے اپنا نام ٹمس بتایا تھا، اسے یہ خبر دی کہ وہ مفرور نوجوان کو جانتا ہے اور اس کے گھر کی نشان دہی بھی کر سکتا ہے۔

''آپ اسے کیسے جانتے ہیں؟'' بخاری نے پوچھا۔

''جناب کچھ نہ پوچھے! کیسا برا زمانہ آ گیا ہے! میں ایک شریف اور معزز شہری ہی نہیں، ایک نوجوان بیٹی کا باپ بھی ہوں۔ وہ بدقسمتی سے ایک دفتر میں کام کرتی ہے۔ آپ ہی بتایئے کیا کسی نوجوان بیٹی کا باپ ہونا گناہ ہے۔''

''بالکل نہیں!'' بخاری نے چائے کی چسکی لیتے ہوئے کہا۔

وہ بوڑھے کے ساتھ ہی نزدیک ہی واقع اس کی کوٹھی تک آ گیا تھا تا کہ اس کا تفصیلی بیان سن سکے۔ بوڑھے نے خود ہی اسے یہ پیش کش کی تھی اور بخاری نے اس کی پیش کش قبول کر لی۔

''لیکن اس ملک میں کم از کم ایک نوکری کرنے والی لڑکی کا باپ ہونا بہت بڑا گناہ ہے۔'' شمس نے بسکٹ کی پلیٹ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

''جناب! آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟'' بخاری نے اس کی شخصیت سے مرعوب ہوتے ہوئے کہا۔

''میری بیٹی آپ کو خود ہی بتا دے گی جو گذشتہ تین روز سے گھر میں پڑی رو رہی ہے۔ اس غنڈے نے میرے نے میری بیٹی کا جینا دوبھر کا دیا ہے۔ جناب والا! اگر قانون نے ہماری مدد نہ کی تو ہم دونوں باپ اور بیٹی خودکشی کرنے پر مجبور ہو جائیں گے۔''

اس کے ساتھ ہی اس نے اپنی بیٹی کو آوازیں دینا شروع کر دیں۔

''سارہ.....! سارہ.....!!''

تھوڑی ہی دیر بعد ایک نوجوان لڑکی ان کے سامنے موجود تھی۔ ایس پی بخاری نے اندازہ لگا لیا تھا کہ مسلسل رونے سے اس کی آنکھیں سوج چکی تھیں۔ اس نے بخاری کی شکل پر نظر پڑتے ہی پھر رونا شوع کر دیا۔

''گھبراؤ نہیں بیٹی! یہ ہمارے دوست ہیں۔ انہیں سب کچھ بتا دو۔ شاباش.....شاباش!'' بوڑھے شمسی نے اپنی بیٹی کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔ لیکن اس کا رونا دھونا تو بند ہونے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔

بمشکل بخاری اور شمسی نے اسے چپ کروایا۔

''انکل! مجھے ڈر لگتا ہے۔ وہ کوئی سرکاری افسر ہے۔ اگر میں نے اس کے خلاف رپورٹ درج کروائی تو وہ ہمارے لیے اور مشکلات پیدا کر دے گا۔''

''گھبراؤ نہیں بیٹی! وہ کوئی بھی ہو۔ قانون کی گرفت سے نہیں بچ سکتا۔'' بخاری نے اسے تسلی دی۔

لڑکی نے اسے بتایا کہ یہ نوجوان کئی روز سے اس کا پیچھا کر رہا ہے اور اس کو آتے جاتے پریشان کرتا ہے۔ اب اس نے دھمکی دی ہے کہ اگر میں نے اس کی بات نہ مانی تو وہ مجھے اغوا کروا لے گا اور میرے بوڑھے باپ کو کسی جھوٹے الزام میں جیل کی سیر کروا دے گا۔ میں نے تو اسکے ہاتھوں پریشان ہو کر نوکری سے بھی استعفیٰ دے دیا ہے۔''

''لیکن آپ نے پولیس میں رپورٹ کیوں نہیں درج کروائی؟'' بخاری نے اس سے پوچھا۔

''جناب! اگر پولیس ایسی رپورٹیں لکھنے لگے تو پھر کوئی اور کام تو کرنے سے رہی۔ باقی سب کچھ تو پھر بھاڑ میں ہی جائے گا۔ دیکھئے نا! ہم عزت دار لوگ ہیں۔ میں نے ارادہ کیا تھا کہ اس نوجوان کے والدین سے ملکر اسے سمجھانے کی کوشش کروں گا۔ میں نے اس کا تعاقب کر کے اس کے گھر کا پتہ لگایا تھا اور آج میرا یہی پروگرام تھا کہ اس کے والدین سے مل کر انہیں سمجھانے کی کوشش کروں۔ اگر وہ بھی میری بات نہ مانتے تب میں پولیس کی مدد ضرور لیتا۔ لیکن یہ کم بخت آج مجھے یہاں راستے ہی میں مل گیا اور دھمکیاں دینے لگا کہ اگر میں اس کے راستے میں آیا تو پولیس سے کہہ کر مجھے ذلیل کروا دے گا۔ آخر یہ کہاں کی شرافت ہے جناب؟ کیا قانون کی حفاظت کرنے والے سو گئے ہیں جو یہ غنڈے شہر میں دندناتے پھر رہے ہیں۔'' بوڑھا جذبات میں بولے جا رہا تھا۔

بخاری نے اسے صبر کی تلقین کی۔ پہلے وہ اس کے ساتھ تھانے میں آیا۔ اس کا بیان لکھوانے کے بعد پھر اس نوجوان کے گھر کی طرف روانہ ہو گیا جس نے اس بے چارے شریف بوڑھے اور اس کی جوان بیٹی کا جینا دوبھر کر دیا تھا۔ روانگی سے پہلے وہ وارنٹ گرفتاری بھی ساتھ ہی لیتا آیا تھا۔ کیونکہ بوڑھے نے بتایا تھا کہ وہ نوجوان کوئی سرکاری افسر ہے۔

دونوں پولیس کی جیپ میں بیٹھے تھے۔ پچھلی سیٹ پر تین سپاہی ہتھکڑیاں اور رائفلیں تھامے بیٹھے تھے۔ آگے بوڑھا اور بخاری' جیپ بخاری خود ہی چلا رہا تھا۔ اچانک ہی اسے جیپ کو بریک لگانی پڑی۔ بات ہی ایسی تھی۔ بوڑھے شمسی نے جس کوٹھی کی نشان دہی کی تھی وہ کیپٹن علی کا گھر تھا۔

''آپ کو یقین ہے یہ وہی گھر ہے؟'' اس نے بوڑھے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''صاحب! میں بوڑھا ضرور ہو گیا ہوں' ابھی سٹھیا نہیں گیا۔ میرے ہوش و حواس قائم ہیں۔ میں آنکھیں بند کر کے اس گھر تک پہنچ سکتا ہوں۔ یہ الگ بات ہے کہ یہ کسی سرکاری افسر کا گھر ہو اور آپ مجھے واپس بھگا کر اس غنڈے کی بات کو سچ ثابت کر دیں۔'' بوڑھے شمسی نے جھلا کر کہا۔

ایک مرتبہ تو بخاری خوشی سے جھوم اٹھا تھا۔ بہت مدت بعد کیپٹن علی کو نیچا دکھانے کا موقع اس کے ہاتھ آیا تھا۔ اس نے بوڑھے سے کہا کہ وہ اپنے بیان پر قائم رہے اور بالکل نہ گھبرائے۔ کوئی اس کا بال بیکا نہیں کر سکتا۔ قانون اس کا ہر طرح ساتھ دے گا۔ بس وہ اپنی بات پر قائم رہے۔

☆☆☆☆☆

کیپٹن علی ابھی بمشکل گھر میں داخل ہی ہوا تھا جب اسے اپنے گھر کے دروازے پر دھینگا مشتی کرنے اور چوکیدار کی اونچی آواز سنائی دی۔ وہ غالباً کسی کو اندر آنے سے منع کر رہا تھا۔ علی فوراً برآمدے میں پہنچا تو اس کی نظر ایس پی بخاری اور پولیس کے کچھ سپاہیوں پر پڑی جو زبردستی دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گئے تھے۔

''کیا بات ہے؟ کیا ہنگامہ مچا رکھا ہے آپ لوگوں نے؟'' اس نے برآمدے میں کھڑے ہو کر کہا۔

''ہنگامے کا علم تو پولیس اسٹیشن جا کر ہو گا۔ فی الحال مجھے اس گھر کی تلاشی لینی ہے۔'' بخاری نے آگے بڑھ کر کہا۔

''بخاری صاحب! آپ ہوش میں تو ہیں۔'' علی نے درشتی سے کہا۔

''تمیز سے بات کرو۔ تمہارے خلاف مکمل ثبوت اور گواہ میرے ساتھ موجود ہے۔ میں تمہیں چوتھی شاہراہ پر ہونے والے قتل کے الزام میں گرفتار کرتا ہوں۔'' بخاری نے اتنا کہہ کر

پستول ہولسٹر سے نکال لیا۔

''پہلی بات تو یہ ہے کہ آپ کو میرے گھر میں بغیر اجازت داخل ہونے کی جرات کیسے ہوئی۔ اب اس شخص کو بلائیے جس نے مجھے قتل کرتے دیکھا ہے۔'' علی نے اپنا دماغ ٹھنڈا رکھا۔

''اجازت کی فکر نہ کرو۔ قانون کے محافظوں کو قاتلوں کو گرفتار کرنے کیلئے اجازت کی ضرورت نہیں ہوتی۔ رہی گواہ کی بات' تو وہ بھی موجود ہے۔''

اتنا کہہ کر بخاری نے ایک سپاہی کو حکم دیا کہ شمسی کو اندر لے آئے۔

شمسی جیسے ہی اندر داخل ہوا' بخاری بول پڑا۔

''یہی ہے وہ شخص کیا؟''

''نہیں جناب!'' اس نے کہا۔

''کون ہے پھر وہ؟'' بخاری کا پارہ چڑھ گیا۔

جواب میں بوڑھے نے عامر کا مکمل حلیہ بیان کر دیا۔

''میرا خیال ہے اب تمہاری تسلی ہو گئی ہو گی۔'' بخاری نے علی سے کہا۔

''آپ کو شرم آنی چاہئے بخاری صاحب! ابھی آپ مجھ پر قتل کا غلط الزام لگا رہے تھے اور اب میرے ساتھی کو ملوث کر رہے ہیں۔''

''تم نے اس نوجوان کو گولی چلاتے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔'' اس نے اب بوڑھے شمسی کو مخاطب کیا۔

''کمال کر رہے ہیں آپ! الٹا مجھ پر ہی دھونس جما رہے ہیں۔ وہاں درجنوں لوگوں نے اسے بھاگتے دیکھا ہے۔'' اس نے جھلا کر جواب دیا۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ اتفاق سے اس وقت وہاں جتنے آدمی بھاگ رہے تھے' قتل کر کے ہی بھاگ رہے تھے۔ یہ بھی ممکن ہے وہ جوگنگ کر رہا ہو۔'' علی نے اسے چڑانے کے لہجے میں کہا۔

''یہ آپ نے مجھے کس چکر میں پھنسا دیا جناب! ایک تو میرے ساتھ زیادتی ہوئی ہے اور الٹا یہ شخص میرا تمسخر اڑا رہا ہے اور آپ منہ اٹھائے اسے دیکھ رہے ہیں۔'' شمسی نے گویا بخاری کی

غیرت کو للکارا۔

''دیکھو مسٹر! تم پولیس کی موجودگی میں گواہ کو ہراساں کر رہے ہو۔'' اس نے علی سے کہا۔

''آپ خاموش رہیئے! اب عدالت ہی اس کا فیصلہ کرے گی۔'' پھر وہ شمسی کی طرف متوجہ ہوا۔

اسی اثناء میں کیپٹن علی کے دونوں خونخوار کتے اس کے نزدیک کھڑے ہو چکے تھے۔

''مجھے اس جگہ کی تلاشی لینی ہے۔ تم نے اپنے ہاں ایک قاتل کو پناہ دے رکھی ہے۔'' بخاری نے اسکی طرف خونخوار نظروں سے دیکھا۔

''ناممکن! اس کے لئے آپ کو وارنٹ لانا پڑے گا۔ آخر میں اس ملک کا ایک باعزت شہری ہوں اور کسی کو اپنے ساتھ زیادتی کرنے کی اجازت نہیں دے سکتا۔'' علی نے پرسکون لہجے میں جواب دیا۔

''قانون کے راستے میں روڑے نہ اٹکاؤ۔ ہمارے ساتھ تعاون کرو۔'' بخاری نے دھمکی کے لہجے میں کہا۔

''اگر آپ میں سے کسی نے ایک قدم بھی آگے بڑھایا تو میں اس پر کتے چھوڑ دوں گا۔'' کیپٹن علی نے کتوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''تمہیں اس کی سزا ضرور بھگتنی پڑے گی، خواہ مجھے نوکری سے استعفیٰ ہی کیوں نہ دینا پڑے۔'' بخاری نے خونخوار کتوں کے تیور دیکھ کر واپس لوٹ جانے ہی میں عافیت جانی تھی۔

''خدا حافظ!'' علی نے اسے واپس جاتے دیکھ کر کہا۔ اس نے چوکیدار کو ہدایت کر دی تھی کہ اب وہ کسی کے لیے گھر کا دروازہ نہ کھولے۔

☆☆☆☆☆

کتوں کو واپس بھیج کر وہ کمرے میں داخل ہوا جہاں فون کی گھنٹی اس کی منتظر تھی۔

''ہیلو'' دوسری طرف سے ڈاکٹر ٹانگو کی آواز سنائی دی۔

''کیسا رہا! ابھی تو ابتدا ہے۔ میں تم لوگوں کو ذلیل کر کے ماروں گا۔''

''بکتے رہو'' علی نے ایک بٹن دبا کر اس گفتگو ریکارڈ کرنی شروع کر دی تھی۔ اس کے ساتھ ہی اس نے ایک اور مشینی بٹن کو دبایا تھا جس کا مطلب یہی تھا کہ اب ایکسچینج سے اس فون نمبر کا پتہ لگائے جہاں سے یہ کال آ رہی تھی۔

''اس مرتبہ بچ گئے۔ کوئی بات نہیں۔ ہر دفعہ ایسا نہیں ہوگا۔'' ٹانگو غرایا۔

''گیدڑ کی موت آتی ہے تو وہ شہر کا رخ ضرور کرتا ہے ٹانگو! تمہاری موت شاید میرے ملک میں میرے ہی ہاتھوں لکھی ہے۔'' علی بولا۔

یہ دیوانے کا خواب ہے کیپٹن علی! میں تمہیں جلد ہی بتا دوں گا کہ تم کس حیثیت کے مالک ہو۔'' اس کے ساتھ ہی اس کی قہقہہ گونجا۔

''بکتے رہو!'' علی نے پھر اسے چڑایا۔

جواب میں ٹانگو نے دوبارہ قہقہہ لگایا۔

''تم بہت چالاک ہو۔ اس میں کوئی شک نہیں۔ لیکن اتنے ہوشیار نہیں کہ میرے فون نمبر کا پتہ کر سکو۔'' اسکے ساتھ ہی سلسلہ منقطع ہو گیا۔

☆☆☆☆☆

ایس۔ پی بخاری اپنے ساتھ بوڑھے شمسی اور اس کی بیٹی کو لے کر سیدھا آئی جی مسٹر شیرازی کے دفتر میں چلا آیا۔ اس نے شمسی کو سمجھا دیا تھا کہ وہ خوب مرچ مصالحہ لگا کر تمام واقعات بیان کر دے۔

تینوں آئی جی صاحب کے دفتر میں بیٹھے تھے۔ باپ اور بیٹی نے باری باری اپنا بیان سنا دیا تھا۔ بوڑھے شمسی نے جی بھر کر کیپٹن علی کے خلاف زہر اگلا تھا۔

''اس نے مجھ پر کتے چھوڑنے کی دھمکی دے کر میری توہین کی ہے جناب اور میں کبھی یہ توہین برداشت نہیں کر سکتا۔'' بخاری نے کہا۔

''آپ لوگ تشریف لے جائیں۔ ہم جلد ہی ملزم کو گرفتار کر لیں گے۔'' انہوں نے بخاری کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے دونوں باپ بیٹی سے کہا۔

دونوں آئی جی کا شکریہ ادا کر کے ان کے دفتر سے باہر نکل آئے۔

''ایس۔ پی صاحب! آپ اب ریٹائرمنٹ ہی لے لیں تو بہتر رہے گا۔'' ان کے جاتے ہی آئی جی صاحب نے بخاری کو مخاطب کیا۔

''کیا مطلب ہے جناب! میں نے کیا گستاخی کی ہے؟'' بخاری نے گھبرا کر کہا۔

''آپ کی ساری زندگی پولیس سروس میں گزر گئی اور آج تک آپ کو سچ جھوٹ کا اندازہ لگانے کی توفیق نصیب نہیں ہوئی۔''

''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں جناب؟''

''آیئے میرے ساتھ!'' انہوں نے بخاری کو دوسرے کمرے میں آنے کا اشارہ کیا جہاں پر ٹانگوا اور کیپٹن علی کی ریکارڈ شدہ گفتگو محفوظ تھی۔ آئی جی صاحب نے ٹیپ کا سوئچ آن کر کے اسے ساری گفتگو سنا دی۔

''آئندہ آپ کیپٹن علی یا اس کے کسی بھی ساتھی کے خلاف کوئی کارروائی خواہ وہ ناگزیر ہی کیوں نہ ہو، میری اجازت کے بغیر نہیں کریں گے۔ اس بات کا خیال رہے کہ آپ سے کئی گنا بڑا اور اس ملک کا قابل فخر آفیسر ہے۔''

بس ان کی یہی ایک بات بخاری کو آگ لگا دیتی تھی۔ وہ بھنا کر ہی تو رہ گیا۔

پراسرار بوڑھا

جیسے ہی شمسی اور اس کی بیٹی آئی جی کے دفتر سے برآمد ہوئے، انسپکٹر ناصر ان سے چپک گیا۔ دونوں کا رخ نزدیکی ٹیکسی سٹینڈ کی طرف تھا۔ ناصر نے اپنی موٹر سائیکل سنبھال لی۔

باپ بیٹی ایک رکشہ میں بیٹھ کر چل دیے۔ انسپکٹر ناصر ایک موٹر سائیکل پر ان کا تعاقب کر رہا تھا۔ ایک چھوٹے سے ڈاک خانے کے قریب شمسی نے رکشہ روک دیا۔ انسپکٹر ناصر موٹر سائیکل سڑک کے کنارے کھڑی کر کے اس کے ساتھ ہی اندر داخل ہو گیا۔ اس نے دیکھا، شمسی نے اپنے کوٹ کی جیب سے ایک گلابی رنگ کا لفافہ نکالا اور ڈاک خانے سے ٹکٹ خرید کر اس پر چسپاں کر دیے۔

یہ لفافہ اس نے ڈاک خانہ کے باہر لگے میل بکس میں ڈال دیا اور واپس رکشہ کی طرف چل دیا۔ انسپکٹر ناصر نے ایک لمحے کے لیے کچھ سوچا پھر وہ تعاقب کا ارادہ ترک کر کے ڈاک خانے کے پوسٹ ماسٹر کے پاس پہنچ گیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد اس نے پوسٹ ماسٹر کے ساتھ میل بکس کھول لیا۔ ابھی کسی اور نے یہاں خط نہیں ڈالا تھا۔ تھوڑی دیر پہلے ہی یہاں سے بڑے ڈاک خانے والے اپنی گاڑی میں ڈاک نکال کر لے گئے تھے۔ اب یہاں چند خطوط ہی موجود تھے اور سب سے اوپر

وہی گلابی رنگ کا لفافہ دھرا تھا۔ انہوں نے باقی خطوط واپس ڈال دیئے اور یہ لفافہ لے کر ڈاک خانے کی بلڈنگ میں چلے آئے۔

انسپکٹر ناصر نے یہاں سے فون کر کے علی کو بلایا تھا۔ علی کی آمد تک وہ بڑے نامحسوس طریقے سے لفافہ کھول چکا تھا۔ دونوں نے اس سے برآمد ہونے والی تحریر پڑھی۔

لکھا تھا:

پیارے ڈاکٹر!

کام تمہاری مرضی کے مطابق ہو رہا ہے لیکن فی الحال مجھ سے رابطہ نہ کرنا۔ میری نگرانی کی جا رہی ہے۔

شمسی۔

کیپٹن علی نے لفافے پر لکھا پوسٹ بکس کا ایڈریس اپنی نوٹ بک میں منتقل کر لیا تھا۔ اس نے خط دوبارہ اتنی صفائی سے لفافے میں بند کیا تھا کہ کسی کو گمان بھی نہ گزرتا کہ یہ خط اس سے پہلے کسی نے کھول کر پڑھا بھی ہے۔ دونوں پوسٹ ماسٹر کا شکریہ ادا کر کے باہر آ گئے۔ پھر اپنی اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گئے۔

علی نے رخصت ہونے سے پہلے انسپکٹر ناصر کو شاباش دی تھی۔ اس نے اپنی حاضر دماغی سے ملزموں کے ایک اور اڈے کا پتہ لگا لیا تھا۔

☆☆☆☆☆

ٹیپو اب روبصحت ہو چکا تھا۔

اس وقت وہ اس پوسٹ بکس کے سامنے کھڑا تھا جس کا نمبر پروفیسر شمسی والے خط پر لکھا ہوا تھا۔ آج اسے دوسرا دن تھا۔ کل صبح سے شام تک وہ یہاں رہا لیکن کوئی یہاں ڈاک لینے نہیں آیا تھا۔ آج دوپہر کے بعد اس نے ایک دفتر کے چپراسی کو جس نے خاکی رنگ کے کپڑے پہن رکھے تھے اس پوسٹ بکس آفس سے ڈاک وصول کرتے دیکھا۔ پوسٹ بکس میں بمشکل تین چار خط موجود تھے۔ چپراسی نے وہ خط اپنے تھیلے میں ڈالے اور واپس چل دیا۔

وہ پیدل ہی جا رہا تھا۔ ٹیپو اس کے پیچھے تھا۔ بمشکل تین چار فرلانگ کا سفر انہوں نے طے کیا تھا جب وہ ایک شاہراہ پر گھوم گیا۔ اس کا رخ ''جیکسن'' نامی ایک پرائیویٹ غیر ملکی کمپنی کے دفتر کی طرف تھا۔

چپراسی کا تعلق اسی کمپنی سے تھا۔ ٹیپو اس کے پیچھے پیچھے کمپنی کے دفتر میں چلا آیا۔ کمپنی کے دفاتر ایک ہال نما کمرے میں موجود تھے جہاں لوگوں کا آنا جانا لگا رہتا تھا۔ اس لیے کسی نے اس کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ ٹیپو نے بھی یہی ظاہر کیا تھا جیسے وہ کسی تلاش کرتا ہوا یہاں تک آیا ہے۔ وہ دراصل یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ چپراسی یہ ڈاک کس شخص کے حوالے کرتا ہے۔ یہ بھی تو ممکن تھا کہ اس شخص نے اس کمپنی کی آڑ لے رکھی ہو۔

چپراسی سیدھا کونے میں لگے ایک کیبن کی طرف جا رہا تھا۔ کیبن کا پردہ ہٹا ہوا تھا اور سامنے میز پر ایک شخص کوئی ٹیلی فون سن رہا تھا چپراسی نے تھیلے سے تینوں خط نکال کر اس کے سامنے رکھ دیئے اور واپس باہر آ گیا۔ ٹیپو نے کیبن کے باہر لگی اس کے نام کی تختی پڑھ لی۔ وہاں لکھا تھا۔

جے۔ ایس۔ فریڈرک۔ پرسنل منیجر۔

اب اس کا رخ نزدیکی ٹیلیفون بوتھ کی طرف تھا جہاں سے فون کر کے اس نے کیپٹن علی کو رپورٹ دی۔ علی نے اسے شاباش دیتے ہوئے گھر پہنچنے کی ہدایت کی تھی۔

☆☆☆☆☆

عامر نے چہرے پر میک اپ کر رکھا تھا۔ یہ اس کا ریڈی میڈ میک اپ تھا جو عموماً وہ لوگ ہنگامی حالت میں استعمال کرتے تھے۔ اس کا اوپر کا ہونٹ گھنی مونچھوں میں چھپا ہوا تھا اور سامنے کے دانت نمایاں دکھائی دے رہے تھے۔ آنکھوں پر اس نے سیاہ رنگ کے شیشے کی عینک لگا رکھی تھی۔ اس کا حلیہ کچھ ایسا تھا کہ اب شمسی تو کیا اس کے فرشتے بھی عامر کو نہیں پہچان سکتے تھے۔

صبح سے شمسی کے گھر کے سامنے موٹر سائیکل لئے کھڑا تھا۔ صبح دس بجے کے بعد اس نے شمسی کو گھر سے برآمد ہوتے دیکھا۔ وہ ایک چھوٹی سی کھٹارہ سی کار چلا رہا تھا۔ ایسی کاریں شہر میں اکا دکا ہی نظر آیا کرتی تھیں۔ جن کی رفتار موٹر سائیکلوں سے بھی کم تھی۔

کار وہ سڑک پر لے آیا تھا اور بلا مقصد مختلف سڑکوں پر گھوم رہا تھا۔ عامر اس کے تعاقب میں تھا لیکن کمال ہوشیاری سے وہ اپنی موٹر سائیکل کبھی کار کے دائیں اور کبھی بائیں ہاتھ کر لیتا۔ اس طرح وہ کار میں لگے شیشے میں نظر نہیں آ سکتا تھا۔ اس نے محسوس کیا تھا کہ بوڑھا شمسی بلا مقصد آوارہ گردی کر کے اپنے تعاقب کا اندازہ لگانا چاہتا ہے۔

عامر نے اسے تعاقب کا احساس ہی نہیں ہونے دیا تھا۔ جب شمسی مطمئن ہو گیا کہ اس کی نگرانی نہیں کی جا رہی تو وہ شہر سے باہر جانے والی سڑک پر آ گیا۔ یہ سڑک ساحل سمندر کی طرف جا رہی تھی اور اس پر رش ذرا کم ہی تھا۔ عامر کو پڑی ہوشیاری سے تعاقب کرنا پڑا۔

خدا خدا کر کے تعاقب کا یہ سلسلہ ساحل سمندر پر بنے ایک ریستوران کے نزدیک ختم ہوا۔ یہ ریستوران بندرگاہ کے نزدیک بنا ہوا تھا اور اکثر ساحل سمندر پر تفریح کرنے والے لوگ یہاں آیا کرتے تھے۔ عامر نے اپنی موٹر سائیکل تیزی سے آگے بڑھائی اور دوسری طرف لے جا کر پارک کر دی۔

اس نے شمسی کو کار پارک کرنے کے بعد اس سے اتر کر ساحل سمندر کی اس سمت جاتے دیکھا جدھر لوگ پکنک منا رہے تھے۔

عامر نے کافی فاصلے سے اس پر نظر رکھی ہوئی تھی۔ سمندر کے اس حصے میں لوگ لانچوں کے ذریعے سمندر کی سیر کر رہے تھے۔ اس نے ایک ایسی ہی لانچ سے ایک ملاح کو اترتے دیکھا جو سیدھا شمسی کی طرف آ رہا تھا۔ دونوں نے اس طرح آپس میں ہاتھ ملایا جیسے پہلے سے ایک دوسرے کے واقف رہے ہوں۔ شمسی نے اسے اپنے ساتھ لیا اور اسی ریستوران کی طرف آ گیا۔

عامر نے اس کا اندازہ بھانپ کر وہاں ایک کونے میں میز سنبھال لی۔ اس کی توقع کے برعکس دونوں ہال میں بیٹھنے کے بجائے کیبن میں جا کر بیٹھ گئے۔ شمسی نے پردہ سرکا لیا تھا جس کی وجہ سے اندر ہونے والی کسی بھی حرکت کو باہر سے نوٹ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ عامر نے کچھ دیر بعد بیرے کو کولڈ ڈرنکس اندر لے جاتے دیکھا۔ قریباً اس منٹ بعد ہی شمسی باہر نکل آیا۔ اس کا ساتھی ابھی ایک تک اندر موجود تھا۔ عامر نے جلدی سے کاؤنٹر پر بل ادا کیا اور اس کے تعاقب میں باہر

آ گیا۔

وہ حیران تھا کہ شمسی کا رخ ٹیکسی سٹینڈ کی طرف ہے حالانکہ وہ اپنی گاڑی میں بیٹھ کر یہاں پہنچا تھا۔ عامر تیز تیز قدموں سے اپنی موٹر سائیکل کی طرف جا رہا تھا۔ اچانک وہ ٹھٹھک کر رک گیا۔

زوردار دھماکے کی آواز سے فضا دہل اٹھی۔ اس نے کار پارک کی طرف نظریں اٹھائیں۔ پروفیسر شمسی کی کار دھماکے سے اڑ گئی تھی جس کا مطلب یہی تھا کہ اس کی کار میں دھماکا ہوا ہے۔ ساحل پر تفریح کے لیے آنے والے لوگوں میں کھلبلی مچ گئی۔ تمام لوگ جائے حادثہ کی طرف بھاگ رہے تھے۔

اس سے پہلے کہ وہ کوئی فیصلہ کرتا، اسے اپنے عقب میں شور سنائی دیا۔ آوازیں ریستوران کی طرف سے آ رہی تھیں۔ عامر بھاگم بھاگ اس کی طرف گیا تو ایک اور خونی منظر اس کے سامنے موجود تھا۔ شمسی کے کیبن میں اس ملاح کی لاش پڑی تھی جسے اس نے شمسی کے ساتھ دیکھا تھا۔ ایک ننھا سا تیر لاش کے حلق میں پیوست تھا۔ یہ ناگو کے گروہ کی خاص نشانی تھی۔

عامر بھاگتا ہوا باہر آیا لیکن شمسی وہاں موجود نہیں تھا۔ وہ غائب ہو چکا تھا۔ اس نے اپنی موٹر سائیکل سنبھالی اور اب وہ سیدھا کیپٹن علی کی طرف جا رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ کیپٹن علی کے سامنے بیٹھا تمام واقعات بیان کر رہا تھا۔

''اب آپ اسے فوراً گرفتار کر لیں۔ اس بات میں کوئی شک نہیں کہ اس نے ملاح کو قتل کیا ہے۔ دھماکا بھی اسی کی کار میں ہوا تھا۔'' اس نے کیپٹن علی سے کہا۔

''کیسی بے وقوفی کی باتیں کر رہے ہو۔ کیا یہ ممکن ہے کہ ہم ڈاکٹر ناگو تک پہنچنے کے ایک اہم ذریعے سے ہاتھ دھو بیٹھیں۔''

''مجھے آپ کی اس منطق کی کچھ سمجھ نہیں آئی۔ قاتل ہمارے سامنے ہے اور آپ اسے گرفتار نہیں کر رہا۔ کیا یہ قانون کا مذاق نہیں؟''

''عامر صاحب! کبھی کبھی قانون کی عظمت کے لیے قانون شکنی بھی برداشت کرنی پڑتی

ہے۔"

"آپ کی باتیں آپ ہی سمجھیں۔ مجھے تو یہ بڈھا کھوسٹ کچھ زیادہ ہی چالاک اور خطرناک دکھائی دیتا ہے۔"

"تمہارا اندازہ بالکل درست ہے اور میرے خیال کے مطابق شاید اس ملک میں ٹانگو کا نزدیک ترین آدمی بھی یہی ہے۔ اب ہمیں اس کے ذریعے ٹانگو تک پہنچنا پڑے گا۔" کیپٹن علی نے کہا۔

دونوں تھوڑی دیر تک موجودہ صورت حال پر تبادلہ خیال کرتے ہوئے۔ پھر عامر اٹھ کر چل دیا۔ اس نے ابھی دوسری ڈیوٹی بھی انجام دینی تھی۔

☆☆☆☆☆

فلیٹ شہر کی ایک ماڈرن آبادی میں بنا ہوا تھا۔ اس آبادی میں دو تین بڑی بڑی بلڈنگوں میں جدید طرز کے فلیٹ تعمیر کئے گئے تھے اور ایک ایسے ہی فلیٹ میں فریڈرک کا قیام تھا۔

ٹیپو گذشتہ چار روز سے اس کے گھر اور دفتر کی نگرانی کر رہا تھا۔ اس دوران اس نے کچھ مشتبہ لوگوں کو فریڈرک سے ملاقات کرتے بھی دیکھا تھا۔ ان میں وہی سمگلر راجہ بھی شامل تھا جس کا تعاقب کرتے ہوئے وہ اور عامر موت کے منہ سے بمشکل بچ پائے تھے۔

آج وہ ایک خصوصی مہم پر نکلا تھا۔ اس نے فریڈرک کی غیر موجودگی میں اس کے فلیٹ میں داخل ہو کر وہاں ایک خصوصی آلہ نصب کرنا تھا جس کے ذریعے اس فلیٹ میں ہونے والی گفتگو کچھ فاصلے پر سنی جا سکتی تھی۔

فریڈرک عموماً سات بجے اپنے فلیٹ میں آیا کرتا تھا۔ اس وقت پانچ بج رہے تھے اور ساری بلڈنگ سنسان پڑی تھی۔ ٹیپو نے بھی یہی موقع مناسب جانا اور پھر پہلی منزل پر پہنچ گیا۔ فریڈرک کا فلیٹ پہلی منزل پر واقع تھا۔ اس نے اچھی طرح اطمینان کر لیا تھا کہ یہاں کوئی اسے نہیں دیکھ رہا۔ اپنی جیب سے اس نے ایک خاص قسم کی چابی نکالی۔ اور اسے فلیٹ کے دروازے کے تالے میں دو نین مرتبہ دائیں بائیں اور اوپر نیچے گھما دیا۔ تالا ہلکی سی آواز پیدا کر کھل گیا۔

ٹیپو پھرتی سے اندر داخل ہوا اور اس سے دوبارہ اندر سے چابی کو اس انداز میں مخالف سمت

بس گھما دیا۔ ایک مرتبہ پھر دروازے کو لاک لگ چکا تھا۔

اس وقت وہ ڈرائنگ روم میں کھڑا تھا۔ سب سے پہلے اس نے ڈرائنگ روم کے عین درمیان لٹکتے ایک خوب صورت گلوب کو دیکھا۔ پھر چند منٹ بعد اس نے یہ آلہ گلوب میں اتنی خوبصورتی سے نصب کیا کہ اس کے نظر آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

اس کے بعد وہ سلیپنگ روم میں پہنچا اور وہاں ایک محفوظ کونے میں دوسرا آلہ نصب کر دیا۔ اپنے کام سے فراغت پا کر وہ واپس پلٹا لیکن ٹھٹھک کر رہ گیا۔ فلیٹ کے باہر سے کسی کے اونچی آواز میں ہنسنے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ اس کے ساتھ ہی اس نے دروازے کے تالے میں چابی داخل ہوتے دیکھ لی۔

اس کی توقع کے برعکس آج فریڈرک وقت سے پہلے ہی آ گیا تھا۔ ٹیپو کو اور کچھ نہ سوجھا۔ وہ پھرتی سے ڈرائنگ روم کی کھڑکی کے سامنے لٹکتے ایک بھاری پردے کے پیچھے چھپ کر کھڑا ہو گیا۔ فی الوقت یہی سب سے محفوظ جگہ تھی۔ کمرہ چونکہ ایئر کنڈیشن تھا' اس لئے اس بات کے امکانات ذرا کم ہی تھے کہ کھڑکی کو کھولا جاتا۔

فریڈرک حسب معمول کمرے میں داخل ہوا۔ ایک صوفے پر گر کر وہ سستانے لگا۔ اچانک ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔

فریڈرک نے لپک کر فون اٹھا لیا۔ ٹیپو کو صرف اتنی سمجھ آ سکی کہ اس نے کسی کو سات بجے یہاں آنے کا وقت دیا تھا۔ اس کے بعد فریڈرک کے ٹیلی فون بند کر دیا اور وہ کچن میں کچھ تیار کرنے چلا گیا۔

ٹیپو نے اس موقع کو غنیمت جانا۔

ابھی اس نے بمشکل ایک قدم ہی اٹھایا تھا کہ دوبارہ اطلاعی گھنٹی بجی۔ ٹیپو پھر اپنی جگہ جم کر رہ گیا۔

فریڈرک کچن سے نکل کر سیدھا اس طرف آیا تھا۔ جب اس نے دروازہ کھول کر آنے والے کو خوش آمدید کہا تو ٹیپو چونکے بغیر نہ رہ سکا۔ یہ تو ولیم تھا۔

غیبی امداد

ولیم کی وہاں آمد ٹیپو کے لئے حیران کن بھی تھی اور پریشان کن بھی۔ وہ تو ٹانگو کے خون کا پیاسا تھا اور یہاں جس شخص کے پاس وہ آیا تھا وہ ٹانگو کا وفادار۔

''یہ بھی تو ممکن ہے ولیم کسی جال میں پھنس گیا ہو۔'' ٹیپو نے سوچا۔

اس کا خیال بالکل درست تھا اور ولیم کو واقعی یہاں دھوکے سے بلایا گیا تھا۔ ٹیپو نے سوچا وہ آخر کیپٹن علی کو اس تازہ واقعہ کی اطلاع کس طرح دے گا۔ یہ تو ممکن ہی نہیں تھا کہ علی نے اسے نظر انداز کر دیا ہو۔ وہ جانتا تھا کہ اپنے ساتھیوں کو کسی بھی مہم پر بھیج کر کیپٹن علی ان کی نگرانی ضرور کرتا ہے۔ یوں بھی اب اس فلیٹ میں ہونے والی گفتگو اسے صاف سنائی دے رہی ہوگی اور عین ممکن ہے کہ وہ ولیم کی آواز پہچان لے۔

ولیم کو ڈرائنگ روم میں بٹھا کر وہ کچن سے اس کیلئے کچھ لینے چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد اس کی واپسی ہوئی تو اس کے ہاتھ میں دو گلاس پکڑے ہوئے تھے۔ ایک گلاس اس نے ولیم کو تھما دیا اور اس سے باتیں کرنے لگا۔ ان کی باتوں سے یہی لگتا تھا جیسے فریڈرک ولیم کی خدمات کسی سرکس شو کیلئے حاصل کرنا چاہتا ہے۔

ٹیپو کو یہ اندازہ لگنے میں دیر نہ لگی کہ اس نے سات بجے کا وقت ٹانگو کو دیا ہے کیونکہ ٹانگو کا اصول تھا کہ وہ اپنے خاص دشمنوں کو اپنے ہی ہاتھوں موت کے گھاٹ اتارا کرتا تھا اور عین ممکن ہے کہ وہ ولیم کو بھی خود ہی مارنا چاہتا ہو۔

ٹیپو کیلئے اس وقت سب سے ضروری بات تھی ولیم کی جان کی حفاظت۔ اس نے اپنی جیب میں موجود اعشاریہ تین پانچ کا ننھا سا پستول باہر نکال لیا اور اسے ہاتھ میں تھام لیا۔ اب وہ کسی بھی لمحے کچھ بھی کر گزرنے کیلئے تیار تھا۔

خدا خدا کر کے سات بجے۔ اس کے ساتھ ہی فریڈرک کے فلیٹ کی اطلاعی گھنٹی بجی۔

فریڈرک تو دروازہ کھولنے چل دیا۔ ٹیپو نے پھرتی سے پستول کا لیور کھینچ کر اسے فائرنگ کے لئے تیار کر لیا۔ دروازہ کھلتے ہی جس شخص پر ٹیپو اور ولیم کی اکٹھی نظر پڑی تھی۔

وہ ڈاکٹر ٹانگو تھا۔

اس وقت ٹانگو نے اپنے ہاتھ میں خنجر پکڑ رکھا تھا اور وہ سیدھا ولیم کی طرف آ رہا تھا۔ فریڈرک نے اس کی مدد کیلئے اپنا پستول نکال کر ولیم پر تان لیا تھا۔

''مسٹر ولیم! امید ہے تم اپنے پرانے دوست سے مل کر خوشی محسوس کر رہے ہو گے۔'' فریڈرک نے ولیم سے کہا۔

''غدار! بے ایمان! کمینے! ذلیل انسان!'' ولیم نے ٹانگو کی طرف دیکھے بغیر فریڈرک سے دانت پیستے ہوئے کہا۔

''اس کا مطلب ہے تمہیں خوشی نہیں ہوئی۔ خیر تمہاری مرضی حالانکہ مجھے یہی امید تھی کہ تم اپنے پرانے دوستوں سے مل کر ضرور خوش ہو گے۔'' اس مرتبہ ٹانگو نے اس کی بات کا جواب دیا تھا۔

''میں تم پر ہزار مرتبہ لعنت بھیجتا ہوں۔'' ولیم نے حقارت سے ٹانگو کی طرف دیکھ کر کہا۔

''بہت اچھی بات ہے! اس سے بھی زیادہ مرتبہ بھیج دو۔ کیونکہ اس کے بعد تم زندہ نہیں رہو گے۔'' ٹانگو نے قہقہہ لگایا۔

''تم ایسا دعویٰ پہلی مرتبہ نہیں کر رہے ٹانگو۔'' ولیم کو غصہ آ رہا تھا۔

''شاید تمہارا دماغ موت کے خوف نے خراب کر دیا ہے۔ جو اس طرح بہکی بہکی باتیں کرنے لگے ہو۔'' ٹانگو بولا۔

''تم جانتے ہو میں کیپٹن علی کا دوست ہوں اسے اس بات کا بھی علم ہے کہ میں اس وقت یہاں ہوں۔ یاد رکھنا! تم یہاں سے کبھی بچ کر نہیں جاؤ گے۔'' ولیم نے اس کی طرف اندھیرے میں تیر پھینکا۔ وہ چاہتا تھا کہ کسی بھی طرح ٹانگو پر گھبراہٹ طاری کر سکے۔

''میں زندہ رہ کر اب کروں گا بھی کیا۔ ولیم تم نے اور تمہارے اس کیپٹن کے بچے نے میرا ایک ٹھکانہ باقی نہیں رہنے دیا۔ اب تو میری زندگی کا صرف ایک ہی مقصد باقی رہ گیا ہے کہ تم اور تمہارے ساتھیوں کی جان اپنے ہاتھوں سے لوں۔ اس لئے میں اس ملک میں آیا ہوں۔'' ٹانگو کا لہجہ بڑا خونخوار تھا۔

''تم یہ حسرت ہی دل میں لے کر مر جاؤ گے ٹانگو۔'' ولیم بولا۔ ''چند لمحوں میں یہاں کیپٹن علی تمہاری زبان کاٹنے کے لئے آ جائے گا۔''

''بلا لو اسے، تمہیں مرنے سے بچا لے۔''

ٹانگو نے خوفناک قہقہہ لگاتے ہوئے اسکی طرف بڑھنا شروع کیا۔ ٹیپو نے پستول سے ٹانگو کے ہاتھ کا نشانہ لے رکھا تھا۔

☆☆☆☆☆

اچانک اطلاعی گھنٹی بجنے لگی۔

ٹانگو نے کھا جانے والی نظروں سے فریڈرک کی طرف دیکھا۔ ''کون مر گیا ہے اس وقت!''

''باس! شاید دودھ والا ہوگا۔'' فریڈرک نے کانپتے ہوئے کہا۔

اس نے ولیم کو پستول کے اشارے سے بیڈروم کی طرف جانے کو کہا کیونکہ یہاں سے دروازہ کھلنے پر اس کے نظر آنے کے امکانات موجود تھے۔ پھر وہ فوراً دروازہ کھولنے چل دیا۔

جیسے ہی اس نے دروازہ کھولا اس کا پستول والا بازو زور سے ڈیش بورڈ پر لگا اور لائٹ آف

۔یوں لگتا تھا جو کسی نے باہر سے اسے دھکا دیکر واپس اندر پھینکا ہو۔

ٹیپو کے پستول نے دوسرے ہی لمحے شعلہ اگلا۔ اس نے ٹانگو کے ہاتھ کا نشانہ لیا تھا۔ کیونکہ نے ٹانگو کو خنجر تول کر سامنے خواب گاہ کے دروازے پر کھڑے ولیم کی طرف پھینکتے دیکھا تھا۔ یہ بات تھی کہ اس سے پہلے خنجر اس کے ہاتھ سے نکل کر دور جا گرا۔

اس کے ساتھ ہی ٹیپو نے اپنی جگہ سے پردہ ہٹا کر ٹانگو پر چھلانگ لگائی۔ اسے یوں لگا جیسے وہ اور ربڑ سے بنے کسی پہاڑ پر گرا ہو۔ ٹانگو نے اسے دونوں ہاتھوں سے چھت کی طرف اچھال ا۔ خیریت گزری کہ وہ کمرے کے کونے میں رکھے صوفے پر گرا۔ ورنہ اس کی ہڈی پسلی برابر تی۔

اس کے ساتھ ہی باہر سے گولیاں چلنے کی آواز سنائی دی۔ یوں لگتا تھا جیسے باہر کچھ لوگوں کی ں میں ٹھن گئی ہو۔ ٹیپو نے اندازہ لگا لیا کہ ٹانگو یہاں اکیلا نہیں آیا تھا اس کے ساتھی بھی باہر در ہے ہوں گے جن کی باہر موجود خفیہ پولیس کے لوگوں سے لڑائی ہو رہی تھی۔

ٹیپو اور ولیم دونوں نے وہیں رک کے رہنے ہی میں عافیت جانی تھی۔

بمشکل دو منٹ بعد ہی کمرے کی لائٹ واپس آ گئی۔ کسی نے دوبارہ سوئچ آن کر دیا تھا۔

سے پہلے اندر داخل ہونے والے عامر اور انسپکٹر ناصر تھے۔ عامر نے فریڈرک کی قمیض کے کے ذریعے اسے قابو کر رکھا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھوں کو ہتھکڑی بھی لگی ہوئی تھی۔ شاید یہ ئی ہتھکڑی اس کو زمین پر گرتے ہی انسپکٹر ناصر نے لگا دی تھی۔

ان سب کے لئے چونکا دینے والی بات یہ تھی کہ ٹانگو وہاں سے غائب تھا۔ اچانک ہی کسی باہر سے پکارا۔

''وہ گیا۔''

اس کے ساتھ ہی دوڑتے قدموں کی آوازیں سنائی دیں۔ شاید خفیہ پولیس کے لوگ اس تعاقب میں لپکے تھے۔ لیکن ٹیپو جانتا تھا کہ اب ٹانگو ان کے ہاتھ آنے سے تو رہا۔

ولیم کی نظر سب سے پہلے اپنے محسن ٹیپو پر پڑی تھی۔ اس نے بے اختیار ٹیپو کو گلے لگا لیا۔

''تم تو میرے لئے غیبی امداد ہی ثابت ہوئے ہو۔'' اس نے بے اختیار ٹیپو کی پیشانی پر بوسہ دیتے ہوئے کہا۔

فریڈرک کو انہوں نے ایک کونے میں گرا دیا تھا۔ ان کی موجودگی ہی میں کیپٹن علی اندر داخل ہوا۔ اس کے ساتھ ہی خفیہ پولیس کے کچھ سپاہی بھی تھے۔ علی کے اشارے پر وہ لوگ فریڈرک کو پکڑ کر اپنے ساتھ لے گئے۔

''میں نے آلے کے ذریعے ولیم کی آواز پہچان لی تھی اور یہ اندازہ لگا لیا تھا کہ ولیم کو دھوکے سے یہاں لایا گیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ہم لوگ حرکت میں آ گئے۔ لیکن افسوس وہ موذی پھر ہمارے ہاتھوں سے نکل گیا۔'' علی نے کہا۔

ولیم نے اس کا شکریہ ادا کیا۔ شدت جذبات سے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ اس نے ایک مرتبہ پھر ٹیپو کو گلے لگا لیا تھا۔

☆☆☆☆☆

انسپکٹر ناصر اور عامر فلیٹ کی تلاشی لے رہے تھے۔ لیکن انہیں کام کی کوئی چیز نہیں ملی تھی۔ فائرنگ کی آواز سن کر دوسرے فلیٹوں کے لوگ یہاں جمع ہو گئے تھے۔ پولیس کے لوگ انہیں واپس لوٹا رہے تھے۔

ٹیپو کی چلائی ہوئی گولی ٹانگو کے ہاتھ میں لگی تھی۔ جس کا ثبوت وہاں فرش پر موجود خون کے قطرے تھے۔ خون کے یہ قطرے کمرے کی دوسری کھڑکی تک چلے گئے تھے۔ کیپٹن علی اور اس کے ساتھیوں نے دیکھا' کھڑکی کھلی تھی اور اس کے ساتھ ہی پائپ گزر رہا تھا۔ انہیں یہ اندازہ لگانے میں دیر نہ لگی کہ ٹانگو اسی راستے سے فرار ہوا ہے۔

ابھی وہ باتیں ہی کر رہے تھے کہ اچانک باہر سے ''آگ' آگ!'' کا شور بلند ہوا۔ تمام لوگ بھاگم بھاگ باہر آئے۔ علی نے فوراً ٹرانسمیٹر کے ذریعے ہنگامی پولیس اور فائر بریگیڈ کو وہاں طلب کر لیا۔ ان کے دیکھتے ہی دیکھتے آگ نے تیزی سے پھیلنا شروع کر دیا تھا۔

پولیس کے جوانوں نے ان کی مدد سے لوگوں کو باہر نکالنا شروع کیا۔ پھر بھی چند لوگ اندر رہ

گھر گئے۔ آگ اتنی برق رفتاری سے پھیلی تھی کہ فائر بریگیڈ کے آنے تک اس نے ساری عمارت کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

تین آدمی اس آگ میں جھلس گئے اور لاکھوں کا نقصان اس کے علاوہ ہوا تھا۔ فائر بریگیڈ اپنی کوششوں کے باوجود آگ پر قابو نہ پا سکا۔ اس نقصان نے کیپٹن علی کو خاصا دل شکستہ کر دیا تھا۔ اس نے اندازہ لگا لیا تھا کہ یہ تخریب کاری ہوئی ہے۔

ابھی اسے گھر پہنچے بمشکل پانچ منٹ ہی گزرے تھے جب ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ کیپٹن علی نے فون اٹھایا۔ دوسری طرف ٹانگو اس سے مخاطب تھا۔

''کیسا رہا میرا انتقام!'' اس نے قہقہہ لگایا۔

''بزدل! کمینے! میں نے آج تک تجھ جیسا گھٹیا مجرم نہیں دیکھا۔ تجھ سے ہم میں بدلہ لینے کی ہمت نہیں۔ بے گناہ شہریوں سے بدلہ لے رہا ہے۔'' علی کا خون کھول رہا تھا لیکن اس نے اپنا دماغ ٹھنڈا رکھا۔

''کیپٹن علی! میں تمہارے سارے ملک کو جلا کر راکھ کر ڈالوں گا۔ تم نے میری ایجادات کو تباہ کر دیا ہے۔ میں تم سب کو تباہ کر دوں گا۔''

''اس کا فیصلہ وقت کرے گا۔'' علی نے فون کریڈل پر پٹخ دیا۔ اسے زندگی میں آج پہلی مرتبہ کسی مجرم کی بزدلی پر غصہ آ رہا تھا۔

☆☆☆☆☆

صبح سے تین مرتبہ وہ دفتر کے اندر چکر لگا کر باہر آ چکا تھا۔ اس دوران بوڑھے شمسی کی بیٹی اپنی میز پر ایک ہی پوزیشن میں بیٹھی دکھائی دیتی تھی۔ عامر دل ہی دل میں دعا مانگ رہا تھا کہ وہ اب جلدی باہر نکلے تاکہ وہ بھی اس فٹ پاتھ سے نجات حاصل کرے۔ اس کی دعا شاید قبول ہو گئی تھی کیونکہ اس نے پانچ بجے کے قریب لڑکی کو باہر نکلتے دیکھا۔

گزشتہ دو روز سے وہ اس کی نگرانی کر رہا تھا اور کام کی ایک بات اس کے پلے نہیں پڑی تھی۔

شمسی کی بیٹی سارہ پیدل ہی شہر کی سب سے بڑی مارکیٹ کی طرف جا رہی تھی۔ پھر عامر نے اس کا رخ ایک خاصے مہنگے ہوٹل کی طرف بدلتے دیکھا۔ اس ہوٹل میں وہی لوگ قدم رکھ سکتے تھے جن کی جیب نوٹوں سے بھری رہتی ہے۔ عام آدمی تو اس کے نزدیک پھٹکنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔

عامر نے ریڈی میڈ میک اپ پہن رکھا تھا۔ سارہ کے تعاقب میں وہ بھی ہوٹل کے ڈائننگ ہال میں پہنچ گیا۔ اس نے ایسی میز منتخب کی تھی جہاں سے سارہ پر نظر اچھی طرح رکھ سکے۔

سارہ اکیلی ہی ایک میز پر بیٹھی تھی۔ شاید اسے کسی کا انتظار تھا۔ اور جب وہ آیا تو عامر کا چونک جانا بالکل فطری بات تھی۔ اس نے ڈائننگ ہال کے دروازے سے اس شخص کو اندر داخل ہوتے دیکھا جس نے اسے یہ دن دکھائے تھے۔

یہ مشہور سمگلر راجہ تھا جس کا تعاقب کرتے ہوئے اس پر قاتلانہ حملہ بھی ہو چکا تھا۔ راجہ نے اپنا حلیہ خاصا تبدیل کر رکھا تھا۔ اس کی مونچھیں خاصی گھنی ہو گئی تھیں۔ چہرے پر چھوٹی چھوٹی داڑھی کے ساتھ اس نے سنہری فریم کی عینک بھی لگا رکھی تھی۔

ہوٹل میں ہلکی موسیقی بج رہی تھی اور اگر عامر کوشش بھی کرتا تو اس کے پلے کچھ نہ پڑتا۔ یوں تو اسے شروع ہی سے اس بے ہودہ موسیقی سے نفرت تھی لیکن آج اس پر خوامخواہ غصہ بھی آ رہا تھا۔ اس نے صرف یہی دیکھا کہ راجہ نے سارہ کو کچھ دیا تھا جو اس نے اپنے بڑے سے بٹوے میں منتقل کر لیا۔

عامر کے ذہن میں فوراً ہی یہ بات آئی کہ اگر انہوں نے الگ الگ سفر کیا تو وہ کس کا تعاقب کرے گا۔ اس خیال کے آتے ہی وہ اٹھ کر کاؤنٹر کی طرف گیا اور دوسرے ہی لمحے ٹیلی فون پر وہ کیپٹن علی سے بات کر رہا تھا جس نے اسے سارہ کے تعاقب کا حکم دیا تھا۔

ٹیلی فون سے فارغ ہو کر وہ دوبارہ اپنی میز پر بیٹھ گیا۔ ابھی اسے بیٹھے بمشکل پانچ منٹ ہی ہوئے تھے جب اس نے سامنے دروازے سے انسپکٹر ناصر کو اندر داخل ہوتے دیکھا۔ ناصر سیدھا اسی کی میز کی طرف آ رہا تھا۔ عامر کی میز کے نزدیک وہ پل بھر کو رکا۔ اسی دوران عامر نے اسے راجہ

کی نشان دہی کر دی تھی۔ ناصر نے مطمئن ہو کر راجہ کے نزدیک ایک میز سنبھال لی۔

تھوڑی دیر بعد سارہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ عامر کی توقعات کے مطابق انہوں نے الگ الگ یہاں سے نکلنے کا فیصلہ کیا تھا۔

سارہ کے گیٹ سے باہر نکلتے ہی عامر اس کے پیچھے پیچھے چل دیا۔ اسے یہی امید تھی کہ سارہ کسی سواری کے ذریعے گھر تک جائیگی۔ اس کا گھر یہاں سے کم از کم ایک میل دور واقع تھا۔ لیکن اس کی توقعات کے برعکس وہ پیدل ہی گھر کی طرف جا رہی تھی۔

شام ڈھل چکی تھی۔ اندھیرا بڑھنے لگا تھا اور عامر سوچ رہا تھا کہ آخر وہ اس بات کا کس طرح پتہ لگائے گا کہ راجہ نے اسے ایسی کیا اہم چیز دی ہے جو اس نے اپنے بٹوے میں رکھی ہوئی ہے۔ اس کا گھر نزدیک آ چکا تھا۔ عامر کو تعاقب بھی درمیان میں فاصلہ رکھ کر کرنا پڑا۔ وہ سارہ کو یہ احساس نہیں دلانا چاہتا تھا کہ اس کا تعاقب کیا جا رہا ہے۔

بہت مغز ماری کے بعد بالآخر اس کے ذہن میں ایک ترکیب آ ہی گئی۔ جو وہ کبھی کبھی صرف ہنگامی حالت میں استعمال کیا کرتا تھا۔ اس ترکیب کے ذہن میں آتے ہی اس نے اپنی جیکٹ کی جیب سے ایک لمبا سرخ رومال نکالا اور اسے اپنے گلے میں باندھ لیا۔ اس کے بعد اس نے اپنے بال بکھیر کر ماتھے پر گرا لئے۔ اب وہ شکل سے ایک چھٹا ہوا غنڈہ دکھائی دیتا تھا۔

سارہ اپنے گھر کے دروازے میں داخل ہونے ہی والی تھی جب اس نے لپک کر سارہ کے ہاتھ سے اس کا بٹوہ چھین لیا۔ سارہ چیختی چلاتی ہی رہ گئی لیکن وہاں کون تھا جو اس کی مدد کرتا۔ شہر میں خواتین کے پرس چھیننے کی وارداتیں ہوتی رہتی تھیں۔ سارہ نے بھی یہی سمجھا تھا جیسے یہ اسی نوعیت کی کوئی واردات ہو گی۔

اس کے چیخنے چلانے پر تین چار لوگ ارد گرد سے عامر کی طرف دوڑے ضرور تھے لیکن وہ ایک اندھیری گلی میں غائب ہو چکا تھا۔ پھر سے چاروں طرف سے ''چور، چور!'' کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔

یہ کسی کو بھی علم نہیں تھا کہ چور آخر گیا کہاں ہے!

☆☆☆☆☆

تھوڑی دیر بعد وہ اپنے اصلی روپ میں کیپٹن علی کے سامنے موجود تھا۔ اس نے علی کے سامنے رکھی میز پر مختلف چہروں کا ڈھیر سا لگا دیا تھا۔ ایک انگوٹھی' پف پاؤڈر' لپ اسٹک' میک اپ کا اور سامان' ایک اعشاریہ تین پانچ کا پستول' کچھ نقدی اور ایک لفافہ۔

''یہ کیا ہے؟'' علی نے حیرت سے پوچھا۔

عامر نے اسے ایک ایک چیز کا نام بتانا شروع کر دیا۔ پھر بولا..... ''یہ تمام چیزیں ایک پرس میں تھیں اور پرس بوڑھے شمسی کی مظلوم بیٹی سارہ کے ہاتھ میں پکڑا ہوا تھا۔''

''یوں کہو نا کہ اس نے بخاری سے تمہاری شکایت کی تھی اور اب تم انتقامی کارروائی پر اتر آئے ہو۔'' کیپٹن علی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''لیکن اس مرتبہ شاید وہ اپنے لئے کوئی رپورٹ نہ لکھوا سکے۔''

''وہ کیوں؟''

کیونکہ اس مرتبہ واقعی اسے لوٹا گیا ہے اور چور دوسرے چوروں کے خلاف شکایت نہیں کیا کرتے۔'' عامر نے اطمینان سے جواب دیا۔

اب تم جو بھی کہو لیکن حقیقت جو تھی میں نے بیان کر دی۔'' علی بدستور مسکرا رہا تھا۔

انہوں نے لفافہ چاک کیا جس میں سے ایک مختصر تحریر برآمد ہوئی۔

''آج رات گیارہ بجے ریڈ لائن۔''

نیچے کسی کا نام نہیں تھا۔ سمجھ نہیں آئی تھی کہ یہ پیغام کس نے کس کو بھیجا ہے۔ نہ بھیجنے والے کا نام لکھا تھا' نہ وصول کرنے والے کا۔

''یہ پیغام ڈاکٹر ٹانگو کی طرف سے شمسی کے لئے ہے۔ کیونکہ وہ دونوں عموماً لفافوں کے ذریعے ایک دوسرے سے رابطہ کرتے ہیں۔'' علی نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

''لیکن یہ پیغام زبانی بھی دیا جا سکتا تھا۔ آخر اتنا لمبا چکر کرنے کی کیا ضرورت پیش آئی تھی۔'' عامر نے پوچھا۔

''ممکن ہے وہ لڑکی کو تمام باتیں بتانا ضروری نہ سمجھتے ہوں اور اس کو صرف ایک ''واسطے'' کی حیثیت دیتے ہوں۔ کیونکہ اب تک یہی بات سامنے آئی ہے کہ ٹانگو کے گروہ کے لوگ عموماً ایک دوسرے سے ناواقف ہوتے ہیں۔ اسی طرح انہیں ایک دوسرے کے معاملات سے بھی بالکل تعلق اور بے خبر رکھا جاتا ہے۔ یہی اس کے اب تک قانون کی گرفت سے بچ رہنے کا راز بھی ہے۔ اس کے گروہ کے لوگ یہ بات بھی جانتے ہیں کہ جس نے اپنی حدود سے تجاوز کرنے کی کوشش کی اسے ٹانگو نے بہت بری موت مروا ڈالا۔ اس لئے یہ لوگ دوسروں کے معاملات میں دخل بھی نہیں دیتے اور صرف اپنے کام سے کام رکھتے ہیں۔'' علی نے اسے بتایا۔

''یہ ریڈ لائن'' کیا بلا ہے۔'' عامر نے پوچھا۔

''سوچنا پڑے گا۔'' علی نے جواب دیا۔

☆☆☆☆☆

ناصر نے اپنے لئے ایک مشروب منگوا لیا تھا۔ بل بھی اس کے ساتھ ہی طلب کر لیا تھا۔ نہ جانے راجہ کس وقت اٹھ کر وہاں سے چل دے۔ اس کی توقع کے مطابق ابھی ناصر نے اپنا مشروب ختم کر کے گلاس ٹرے میں رکھا ہی تھا جب راجہ نے بیرے کو اشارے سے بل لانے کی ہدایت کی۔

راجہ بھی پیدل ہی باہر آیا تھا۔ اس نے ایک معروف ترین شاہراہ کا انتخاب پیدل چلنے کیلئے کیا تھا۔ شاید اس طرح وہ تعاقب سے باخبر رہنا چاہتا تھا کیونکہ ایسے مقامات پر تعاقب کرنے والے کو با آسانی ڈاج کیا جا سکتا تھا۔

ان کے سفر کا اختتام اس عمارت پر ہوا جہاں ایک مرتبہ وہ ٹونی کے ہاتھوں سے نکل گیا تھا۔ انسپکٹر ناصر بہت محتاط تھا۔ عمارت کے اکثر دفاتر میں چھٹی ہو چکی تھی۔ اس لئے سیڑھیوں پر بھی لوگوں کی آمد و رفت کچھ زیادہ ہی تھی۔ ناصر جانتا تھا کہ اس عمارت کے کسی نہ کسی دفتر کا تعلق ٹانگو سے ضرور ہے کیونکہ اس سے پہلے ٹیپو یہاں تک پہنچ چکا تھا۔

راجہ سیڑھیوں کے ذریعے ہی اوپر جا رہا تھا۔ یوں بھی یہاں شام 6 بجے کے بعد لفٹ سروس

بند کردی جاتی تھی۔ دوسری منزل کے کمرہ نمبر 40 کے سامنے وہ رکا۔ پھر دروازہ کھول کر اندر داخل ہوگیا۔ ناصر اس کے تعاقب میں 40 نمبر کمرے کے باہر لگے چھوٹے سے بورڈ سے اس دفتر میں موجود آفس کا نام پڑھ رہا تھا۔

یہ ایک کلیرنگ ایجنسی کا دفتر تھا۔ ناصر واپس آ کر راہ داری کے کونے پر کھڑا ہوگیا۔ اسے راجہ کی واپسی کا انتظار تھا۔

راجہ کی واپسی قریباً آدھ گھنٹے کے بعد ہوئی۔ اس مرتبہ وہ سیدھا کار پارکنگ کی طرف گیا۔ ناصر نے ٹیکسی کی تلاش میں ادھر ادھر نظریں دوڑائیں لیکن بے سود۔

اس کے دیکھتے ہی دیکھتے راجہ ایک کار میں بیٹھ کر وہاں سے چل دیا۔ ناصر صرف اس کار کا نمبر ہی نوٹ کر سکا۔ بہر حال اسے اس بات کی خوشی تھی کہ ان لوگوں کے ایک اور ٹھکانے کا علم تو ہوا۔

☆☆☆☆☆

عامر اور علی دونوں اپنے سامنے ڈائریکٹری پھیلائے بیٹھے تھے۔ ایک گھنٹہ اپنی مغز ماری کرتے ہوئے ہوگیا تھا لیکن ''ریڈ لائن'' نام کی کوئی چیز اس سے برآمد نہیں ہوئی تھی۔

''وہ مارا!'' اچانک علی کے منہ سے نکلا۔

اسے شاید کچھ اچانک یاد آ گیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی وہ ٹیلی فون کی طرف لپکا۔ اب وہ ایک شپنگ کمپنی کے دفتر میں فون کر رہا تھا۔ ''ریڈ لائن'' کی آمد کب تک متوقع ہے؟'' اس نے فون ملنے پر پوچھا۔

''انتظار کیجئے جناب!'' دوسری طرف سے کہا گیا۔ پھر اسے بتایا گیا کہ آج ہی ''ریڈ لائن'' نامی جہاز کی آمد کی اطلاع ملی ہے۔ جہاز رات کے پہلے پہر بندرگاہ پر پہنچے گا۔

''تو ان لوگوں نے آج رات گیارہ بجے بحری جہاز ریڈ لائن پر ملاقات کرنی ہے۔ ظاہر ہے کوئی غلط کام ہی ہوگا۔ شاید کچھ اسلحہ وغیرہ سمگل ہو کر آ رہا ہو۔'' عامر نے اپنا خیال ظاہر کیا۔

''میرا بھی یہی خیال ہے۔'' علی نے کہا۔

ناصر کی رپورٹ موصول ہو چکی تھی۔ انہوں نے اب رات کو ''ریڈ لائن'' سے متعلق منصوبہ بندی پر غور شروع کر دیا۔

''ریڈ لائن'' ایک افریقی ملک کی جہاز راں کمپنی کا جہاز تھا۔ یہ ملک اکثر ڈاکٹر ٹانگو کو اپنے ہاں پناہ دے دیا کرتا تھا اور کیپٹن علی کی اطلاعات کے مطابق ٹانگو جب مڈاشا سے فرار ہوا تو اس نے اسی ملک میں پناہ لی تھی۔

''ریڈ لائن'' اس وقت کھلے سمندر میں ساحل سے دور لنگر انداز تھا۔ ابھی تک اسے کلیرنس نہیں ملی تھی۔ کلیرنس کے ملنے کے بعد ہی وہ ڈیک پر جا سکتا تھا۔ اس وقت رات کے قریباً گیارہ بج رہے تھے اور جہاز کا کپتان جہاز کے عرشے پر آنکھوں سے دوربین لگائے کھڑا تھا۔ اس کی نظریں ساحل پر جمی ہوئی تھیں۔

جوں جوں وقت آگے بڑھ رہا تھا اس کی پریشانی بھی بڑھتی جا رہی تھی۔ ایک دو مرتبہ اس نے اپنے نائب سے جو اس کے نزدیک ہی کھڑا تھا' دریافت کیا۔

''تمہیں یقین ہے گیارہ بجے کا وقت ہی تھا۔''

''جی ہاں جناب! ایسی بات میں کبھی بھول سکتا ہوں۔'' اس کے نائب نے جواب دیا۔

اچانک کپتان کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ اس نے دور اندھیرے میں ساحل کی جانب سے تین مرتبہ ایک ٹارچ کو جلتے بجھتے دیکھا تھا۔ اسے اس اشارے کا انتظار تھا جیسے ہی اشارہ موصول ہوا اس نے اپنے نائب کو نیچے روانہ کر دیا۔ خود وہ اکیلا عرشے پر کھڑا رہا۔

تھوڑی دیر بعد ایک لانچ کے انجن کی آواز سنائی دی اور ایک لانچ بڑی تیز رفتاری سے ''ریڈ لائن'' کی طرف بڑھنے لگی۔ جہاز کے نزدیک پہنچنے پر لانچ کے انجن بند ہوگئے۔ اسے جہاز کے ساتھ لوہے کے رسے سے باندھ دیا گیا۔ اب ایک سیڑھی جہاز سے لانچ میں لٹکائی جا رہی تھی۔

تھوڑی دیر بعد ہی راجہ اس سیڑھی کی مدد سے جہاز میں پہنچ گیا۔

جیسے ہی راجہ جہاز پر سیڑھی کے ذریعے پہنچا اسے تین مسلح گارڈوں نے اپنے گھیرے میں لے لیا۔

"کوڈ؟" ایک شخص نے اس کی طرف رائفل تانے دریافت کیا۔

جواب میں راجہ نے اپنے منہ سے ایک لفظ ادا کیا تو وہ شخص اسے اپنے ہمراہ جہاز کے عرشے پر کپتان کے پاس لے آیا۔ کپتان کے پاس پھر اس نے کچھ کوڈ ورڈز کا تبادلہ کیا۔

کپتان اسے اپنے ہمراہ لئے جہاز کے انجن روم میں چلا آیا۔ انجن روم کے ایک خفیہ تہ خانے کو کھول کر اس نے وہاں سے جہاز کے ملازموں کی مدد سے دو لکڑی کے بڑے بڑے بکس نکالے اور انہی لوگوں نے وہ بکس لانچ میں پہنچا دیئے جس میں پہلے ہی سے راجہ کے ساتھی ان بکسوں کے منتظر تھے۔

جیسے ہی بکس لانچ میں پہنچے' راجہ بھی سیڑھی کی مدد سے لانچ میں اتر آیا۔ اس کے ساتھ ہی رسہ کھول دیا گیا۔ لانچ کے انجن سٹارٹ ہوئے اور اب وہ بڑی تیز رفتاری سے واپس جا رہی تھی۔

اس مرتبہ لانچ نے واپسی کیلئے بڑا لمبا چکر کاٹا تھا اور جہاز کے مخالف سمت دو تین میل کا زائد فاصلہ طے کر کے ساحل کی طرف جا رہی تھی۔

جوں جوں لانچ ساحل کے نزدیک پہنچ رہی تھی' ساحل پر بیٹھے کیپٹن علی اور اس کے ساتھیوں کی بے چینی میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ بالآخر علی نے اپنے ہاتھ میں پکڑے ٹرانسمیٹر پر ایک مخصوص سگنل جاری کر دیا۔

یہ سگنل دراصل ساحل کے کٹاؤ میں چھپے کوسٹ گارڈ کی دو تیز رفتار کشتیوں کیلئے تھا۔ جنہوں نے اشارہ پاتے ہی کھلے سمندر میں آ کر لانچ کو گھیرے میں لے لیا۔

یہ سب کچھ اتنا اچانک تھا کہ لانچ میں موجود لوگ گڑبڑا کر رہ گئے۔ انہوں نے فائرنگ شروع کر دی۔ لیکن زیادہ دیر تک مقابلہ نہ کر سکے اور جلد ہی انہوں نے ہتھیار ڈال دیئے کیونکہ ان کا ایک ساتھی مارا جا چکا تھا۔

راجہ اپنے تین ساتھیوں سمیت گرفتار ہو چکا تھا جب ان لکڑی کے بکسوں کو کھولا گیا تو سب کی آنکھیں حیرت سے کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ ان میں وہ خطرناک گنیں بھی تھیں جن کے ذریعے ٹانگو کیپٹن علی کے ملک میں تباہی مچا سکتا تھا۔

ٹیپو اور ناصر کوٹھی کے بائیں باغ میں چھپے ہوئے تھے۔

یہ بوڑھے شمسی کی کوٹھی تھی اور وہ دونوں شام ہی سے اس کی نگرانی کر رہے تھے۔ شمسی ابھی تک واپس نہیں لوٹا تھا۔ اب رات گہری ہونے لگی تھی۔ انہوں نے کوٹھی سے سامنے والی سڑک کے کنارے پر اپنی گاڑی پارک کر رکھی تھی۔

اچانک وہ چونکے۔

سڑک پر دور سے انہیں کار کی ہیڈ لائٹس دکھائی دے رہی تھیں۔ پھر انہیں ایک کار تیز رفتاری سے اس طرف آتی نظر آئی۔ اس کار کو پروفیسر شمسی ڈرائیو کر رہا تھا۔

کوٹھی کے باہر اس نے کار روک کر اطلاعی گھنٹی بجائی دروازہ اس کی بیٹی سارہ نے کھولا۔ پھر اس نے کنڈی لگا دی۔

شمسی نے اس سے کچھ کہا اور دونوں قریباً بھاگتے ہوئے کوٹھی کے برآمدے تک آئے۔ پھر اندر کمرے میں داخل ہو گئے۔

کمرے میں داخل ہو کر انہوں نے دروازہ بند کر لیا۔ ناصر نے ٹیپو کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھا۔ پھر دونوں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے کو دیکھا۔ ٹیپو نے ناصر کا مطلب سمجھ لیا تھا۔ آج میں نے خاص طور سے ربڑ کے جوتے اسی مقصد کے پیش نظر پہنے تھے۔

بلی کی طرح دبے پاؤں چلتا وہ اس کمرے کی پشت پر آ گیا جس میں دونوں بند تھے۔ اندر لائٹ جل رہی تھی۔ ٹیپو نے پنجوں کے بل کھڑے ہو کر ایک کھڑکی سے اندر جھانکا۔ دونوں بڑی افراتفری کے عالم میں کچھ چیزیں اکٹھی کر کے ایک بریف کیس اور ٹرنک میں ٹھونس رہے تھے۔

"جلدی کرو جلدی! ہمیں فوراً یہاں سے نکلنا ہے۔"

ٹیپو کو پروفیسر کی آواز سنائی دی۔ وہ سارہ کو ہدایات دے رہا تھا۔

ٹیپو سمجھ گیا کہ یہ لوگ یہاں سے فرار ہونے کا منصوبہ بنا رہے ہیں۔ وہ اپنی جگہ سے نیچے آیا اور ایک مرتبہ پھر دبے قدموں چلتا انسپکٹر ناصر کے پاس پہنچا جو اپنی جگہ چھپا بے چینی سے اس کا منتظر تھا۔

ٹیپو نے اسے سرگوشی میں بتایا کہ دونوں فرار ہونے کا ارادہ رکھتے ہیں۔

''میرے خیال میں ان کا تعاقب ضروری ہے۔'' انسپکٹر ناصر نے کہا۔

''ٹھیک ہے!'' ٹیپو بولا۔

دونوں کوٹھی سے نکل کر اپنی کار تک آئے۔ کار انسپکٹر ناصر خود چلا رہا تھا اور ٹیپو اس کے ساتھ اگلی سیٹ پر بیٹھا کار میں لگے ٹرانسمیٹر کے ذریعے کیپٹن علی کو تازہ صورتحال بتا رہا تھا۔

''تعاقب جاری رکھو۔ مجھے پل بھر کی اطلاع دینا۔'' علی نے اسے سمجھایا۔

تھوڑی دیر بعد انہوں نے شمسی کو تیز رفتاری سے کار ڈرائیو کر کے باہر آتے دیکھا۔ انسپکٹر ناصر نے گاڑی اس کے پیچھے لگا دی۔ انہوں نے اپنی کار کی لائٹس بجھا رکھی تھیں اور انسپکٹر ناصر بڑی ہوشیاری سے شمسی کی کار کی ہیڈ لائٹس کے ذریعے اس کا تعاقب کر رہا تھا۔

''ہم آٹھویں شاہراہ پر آ گئے ہیں۔'' ٹیپو نے کیپٹن علی کو ٹرانسمیٹر پر بتایا۔

''شاباش! اسے نظروں سے اوجھل نہ ہونے دینا۔ تمہاری مدد کیلئے پولیس کی گشتی گاڑیاں اس علاقے کی طرف بھیج دی گئی ہیں۔'' کیپٹن علی نے جواب دیا۔

آٹھویں شاہراہ سے اب شمسی نے یک دم کار کا رخ ایک نزدیکی ماڈرن آبادی کی طرف موڑ دیا تھا۔ پھر ایک شاندار کوٹھی کے سامنے وہ رک گیا۔

سارہ نے نیچے اتر کر دروازے کو ہاتھ مارا۔ دروازہ شاید پہلے ہی سے ان لوگوں کیلئے کھلا رکھا گیا تھا۔ جیسے ہی شمسی کی کار اندر داخل ہوئی' سارہ نے دروازہ بند کر دیا۔

دونوں نے اپنی کار کچھ فاصلے پر کھڑی کر دی تھی۔ پھر ٹیپو نیچے اترا اور اس نے اس کوٹھی کا نمبر پڑھا۔ واپس کار میں آ کر اس نے علی کو اطلاع دی جس نے انہیں واپس آنے کو کہا۔

ان کی جگہ لینے کیلئے خفیہ پولیس کی ایک گاڑی علی نے اس طرف روانہ کر دی تھی۔

☆☆☆☆☆

رات دیر گئے تک دونوں اسلحے کے متعلق بحث کرتے رہے۔ اسی طرح کا خطرناک اسلحہ انہیں پرتاب گڑھ میں ملا تھا۔

''میرے خیال میں یہ اسی خطرناک اسلحے کی آخری قسط ہے جو اس شیطان نے منگوائی تھی۔'' عامر نے اپنا خیال ظاہر کیا۔

''ممکن ہے یہ بات صحیح ہو۔ کیونکہ ایسے خطرناک آدمی کے متعلق کوئی حتمی بات نہیں کہی جا سکتی۔'' علی نے اپنی رائے ظاہر کی۔ ''پھر بھی خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ تمہارا شمسی کی بیٹی سے پرس چھیننا کچھ تو کام آیا۔''

دونوں کچھ دیر باتیں کرتے رہے۔ پھر سونے کیلئے چلے گئے۔ جب عامر بستر پر لیٹا تو رات کے دو بج رہے تھے۔

اس وقت صبح کے چھ بجے تھے اور عامر کو مجبوراً اٹھ کر بیٹھنا پڑا کیونکہ خانساماں پچھلے پندرہ منٹ سے اسے مسلسل آوازیں دے کر بیدار کر رہا تھا۔ پہلے تو اس نے یہی سوچا تھا کہ وہ خود بخود تنگ آ کر چلا جائے گا لیکن خانساماں تو اپنی جگہ سے ہلنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔

''کیا ہوا! کیا مصیبت آ گئی؟'' اس نے چادر سے اپنا سر باہر نکال کر خانساماں سے کہا۔

''جناب کچھ نہیں ہوا۔ کوئی مصیبت نہیں آئی۔ بس بڑے صاحب ناشتے کی میز پر آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔''

''مجھے نہیں کرنا ناشتہ۔ اور انہیں کہو میرا انتظار نہ کریں۔ میں کوئی بس یا ریل کار نہیں' گوشت پوست کا انسان ہوں جس کیلئے نیند ضروری ہے۔'' عامر نے لیٹے لیٹے جواب دیا۔

''لیکن جناب مجھے تو انہوں نے حکم دیا ہے کہ جب تک آپ اٹھ کر کھڑے نہ ہو جائیں میں اپنی جگہ سے جنبش بھی نہیں کر سکتا۔''

''اچھا یار! خدا کیلئے! اب تو میں جاگ اٹھا ہوں۔''

''لیکن آپ باتھ روم تک نہیں گئے۔'' خانساماں نے دانت نکالتے ہوئے کہا۔

''یار تم کیا خدائی فوجدار ہو۔'' عامر نے غصے سے کہا۔

''نہیں جناب! میں تو خانساماں ہوں۔'' اس نے بڑی معصومیت سے جواب دیا۔

''تم خانساماں ہو؟'' عامر نے اٹھ کر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''جی ہاں جناب!''

''اچھا یہ بتاؤ بھنڈی کا بھرتہ کیا ہوتا ہے؟''

''جناب میں نے تو اس کا کبھی نام بھی نہیں سنا۔ بینگن کا بھرتہ ضرور سنا ہے۔''

''کمال ہے! تم نے بھنڈی کے بھرتے کا نام بھی نہیں سنا اور تم خانساماں ہو۔'' عامر نے اسے ڈانٹنے کے انداز میں کہا۔

''جناب میں نے آج تک اسے دیکھا ہی نہیں۔''

''تم نے ابھی دیکھا ہی کیا ہے۔ اچھا کبھی لگڑ بگا دیکھا ہے؟'' عامر نے اگلا سوال کیا۔

''جناب میں تو ان پڑھ ہوں۔ آپ نے میرا امتحان لینا شروع کر دیا ہے۔ میں تو آپ کو باتھ روم تک پہنچانے آیا ہوں۔''

''ٹھیک ہے۔ تم پہلے صاحب سے بھنڈی کا بھرتہ بنانے کی ترکیب پوچھ آؤ پھر میں بھی اٹھ جاؤں گا۔'' عامر نے اسے بازو سے پکڑ کر کمرے سے باہر نکالتے ہوئے کہا۔

اب خانساماں کیپٹن علی کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑا اس سے بھنڈی کا بھرتہ بنانے کی ترکیب دریافت کر رہا تھا۔

''میں بتاتا ہوں اسے۔ تم کچن میں جاؤ۔'' علی نے اسے کہا اور خود عامر کے کمرے کی طرف چل دیا۔

اس نے عامر کو کان پکڑ کر کھڑا کر دیا۔ پھر اسے اسی طرح پکڑ کر باتھ روم تک پہنچا دیا۔

دونوں اس وقت ناشتے کی میز پر بیٹھے تھے کیپٹن علی نے اسے ناصر اور ٹیپو کی کارکردگی سے آگاہ کرنے کے بعد کہا کہ وہ فوراً جائے اور نگرانی پر موجود لوگوں کی جگہ لے لے۔

''دنیا میں کوئی کسی اور کی جگہ نہیں لے سکتا۔'' عامر نے بڑے پہنچے ہوئے فقیروں کی طرح آنکھیں بند کر کے کہا۔

''میں نے تمہیں کسی مزار پر نہیں بشمی کے گھر جانے کو کہا ہے۔'' علی بولا۔

''سب کا اصلی گھر قبر ہے۔ سب نے آخر وہیں جانا ہے۔ اس کے علاوہ سب عارضی گھر

ہیں۔'' عامر نے پھر درویشوں کی طرح آنکھیں بند کرتے ہوئے کہا۔

''اگر وہاں جا کر بھی اسی طرح اونگھتے رہے تو اصلی گھر بھی پہنچ ہی جاؤ گے۔'' علی بولا۔

''جلد یا بدیر جانا تو وہیں ہے۔'' عامر کی آنکھیں بند ہی تھیں جب علی نے دوبارہ کان سے پکڑ کر کھڑا کیا پھر دھکا دے کر کمرے سے باہر نکال دیا۔

''کیوں فقیر کو دھکا دیتا ہے بابا!'' عامر نے باہر نکلتے ہوئے کہا۔ ''ہم خود ہی چلے جاتے ہیں۔''

کیپٹن علی بے اختیار ہنس پڑا۔

قربانی کے بکرے

عامر پچھلے دو گھنٹے سے کوٹھی کے گرد چکر لگا رہا تھا۔ لیکن ابھی تک نہ کوئی اندر گیا تھا نہ ہی کوئی باہر آیا تھا۔ اس وقت بھی وہ ہونقوں کی طرح منہ اٹھائے کوٹھی کے سامنے ایک درخت کے نیچے کھڑا تھا جب ایک کار اس کے نزدیک آ کر ٹھہر گئی۔

''معاف کیجئے جناب!'' کسی نے عامر کو مخاطب کیا۔

''کر دیا۔'' اس نے گردن موڑے بغیر جواب دیا۔

''لیکن ہماری طرف دیکھو تو سہی۔'' دوسری آواز سنائی دی۔

جب عامر نے آواز کی طرف گردن گھما کر دیکھا تو کار کی اگلی سیٹ پر ایک معزز سا آدمی بیٹھا اسکی طرف مسکراتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے عامر کو پچھلی سیٹ پر بیٹھے دو آدمیوں کی طرف دیکھنے کو کہا تھا۔ عامر نے ادھر دیکھا تو دو پستولوں کی نالیاں اس کی طرف اٹھی ہوئی تھیں۔

''آپ کو واقعی مجھ ہی سے کام ہے؟'' عامر نے بظاہر حیرانگی سے پوچھا۔

''جناب!'' مختصر جواب ملا۔

''فرمایئے؟''

''آپ اندر تشریف لائیں تو ہم بھی کچھ عرض کریں۔'' اس شخص نے کہا۔

ابھی اس کی بات بمشکل مکمل ہی ہوئی تھی جب پچھلی سیٹ پر بیٹھے مسلح آدمیوں میں سے جو شکل ہی سے کوئی چھٹا ہوا غنڈہ لگتا تھا' باہر نکل آیا۔ اس نے عامر کو بازو سے پکڑا اور دھکا دے کر کار کے اندر بٹھا دیا۔

اب صورتحال یہ تھی کہ وہ مسلح غنڈوں کے درمیان پھنسا بیٹھا اپنی قسمت کو کوس رہا تھا کہ بیٹھے بٹھائے یہ کیا مصیبت آن پڑی۔

''ہم نے سوچا آپ دو گھنٹے سے پریشان ہو رہے ہیں۔ شاید راستہ بھول گئے ہیں۔ کیوں نہ آپ کے گھر پہنچا دیں۔'' اگلی سیٹ والے نے'' چہکتے ہوئے کہا۔

شکریہ! لیکن! اس تکلف کی کیا ضرورت تھی۔'' عامر نے اپنے لہجے کی شوخی برقرار رکھتے ہوئے کہا۔ وہ کسی کمزوری کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔

''یہ تو جناب ذرا ایسے ہی آپ کے اعزاز میں۔'' اس نے کہا۔

''میرے اعزاز میں کوئی پارٹی بھی تم لوگوں نے منعقد کی ہوگی۔'' عامر نے کہا۔

''آپ تو خاصے عقل مند ہیں جناب! ہر بات جانتے ہیں وہی آدمی بولا۔

''نئے پھنسے ہوئے لگتے ہو۔'' عامر نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

''کیا فرمایا جناب؟''

''جلدی سمجھ جاؤ گے برخوردار!''

''معلوم نہیں آپ کیا فرما رہے ہیں؟''

''اس کا تو اصول ہی یہی ہے' جہاں جاتے تمہارے جیسے قربانی کے بکرے پیدا کر لیتا ہے۔ پھر انہیں مروا کر خود بھاگ جاتا ہے۔''

''مجھے بالکل علم نہیں آپ کیا کہنا چاہتے ہیں۔''

وہ شخص بھی خاصا ہوشیار نظر آتا تھا اور ٹانگو کی طرف آنے پر تیار ہی نہیں تھا۔

''اگر تم نے مرنے کا ارادہ کر ہی لیا ہے تو میں کیا کر سکتا ہوں۔'' عامر بولا۔

''یہ باتیں بہت کرتا ہے۔ پہلے اس کی زبان کیوں نہ بند کر دیں۔'' پیچھے بیٹھے غنڈوں میں سے ایک نے کہا۔

''شٹ اپ!'' آگے والے نے اسے ڈانٹا۔ ''اگر یہ اپنے دل کا غبار نکالنا چاہتا ہے تو بے چارے کو بولنے دو۔ ہمارا کیا لیتا ہے۔''

''او کے باس!'' پیچھے والے غنڈے نے کہا۔

وہ لوگ شہر سے نکلنے کے بجائے شہر ہی کی ایک اور ماڈرن آبادی کی طرف مڑ گئے۔ دونوں نے اپنے پستول اس پوزیشن میں رکھے ہوئے تھے کہ یہ احساس ہی باہر سے دیکھنے پر نہیں ہوتا تھا گویا وہ کسی کو اغوا کر کے لے جا رہے ہوں۔ انکے سفر کا اختتام ایک اور شاندار بنگلے پر ہوا۔

ڈرائیور کے ہارن دینے پر کسی نے دروازہ کھولا۔ وہ کار کو سیدھا بنگلے کے برآمدے تک لے آیا تھا۔ مین گیٹ جس پہرے دار نے کھولا تھا اسی نے بند کیا۔

اب برآمدے میں تین اور مسلح گارڈ اس کے استقبال کو موجود تھے۔ وہ لوگ بظاہر یہ تاثر دے رہے تھے۔ جیسے اس کو بہت عزت و احترام سے یہاں لایا گیا ہے۔ عامر بھی خود کو کسی مملکت کا شہزادہ جان کر بڑا اکڑا اکڑ کر کار سے باہر نکلا تھا۔

''اس طرف تشریف لے آئیں جناب!'' اس شخص نے کہا جسے یہ لوگ اپنا باس کہتے تھے۔

''ٹھیک ہے! ٹھیک ہے! کہنے کی ضرورت نہیں۔ ہم جانتے ہیں۔''

عامر اس کے پیچھے پیچھے چلتا ایک شاندار ڈرائنگ روم تک پہنچا۔ اس کمرے کی کوئی کھڑکی نہ تھی۔ چھت کے نزدیک ایک ایگزاسٹ فین نصب ہوا نظر آ رہا تھا۔ کمرہ ایئر کنڈیشن تھا۔

''امید ہے جناب کو کمرہ پسند آیا ہوگا۔ آپ نے یہیں قیام فرمانا ہے۔'' اس شخص نے جھکتے ہوئے بڑے ادب سے کہا۔

''ہمیں زیادہ خوشی ہوتی اگر ہمارا دل بہلانے کیلئے وہ بونا بھی یہاں موجود ہوتا۔'' عامر نے ٹانگو کی طرف اشارہ کیا تھا۔

''آپ کی خواہش کا احترام کیا جائے گا۔ عظیم ٹانگو جلد آپ سے ملاقات کریں گے۔'' اس شخص نے کہا۔

''اب تم دفع ہو جاؤ۔'' عامر بولا۔

''میں جاتا ہوں جناب! لیکن ایک عرض کئے دوں کہ اس دروازے میں ہر وقت بجلی کا کرنٹ موجود رہتا ہے۔ لہٰذا اسے کھولنے یا اس کے نزدیک جانے کی کوشش نہ کیجئے۔'' اس نے احد دروازے کی طرف اشارہ کیا جس سے وہ کمرے میں داخل ہوئے تھے۔

کمرے کا یہ دروازہ المونیم کا بنا ہوا تھا اور اس کے باہر تینوں مسلح پہرے دار کھڑے دکھائی دے رہے تھے۔

''یہ تو تم لوگوں نے زیادتی کی۔ بھلا اس خوبصورت جگہ سے واپس جانے کو کس کافر کا دل چاہے گا۔'' عامر بولا۔

''ہماری خوش نصیبی ہے جو آپ ہمارے مہمان بنے۔'' وہ شخص عامر سے کم نہیں تھا۔ اس نے جھکتے ہوئے کہا۔

اس سے پہلے کہ عامر کوئی اور بات کرے وہ باہر نکل گیا۔ دروازہ شاید کسی خودکار نظام کا تابع تھا۔ جیسے ہی وہ شخص باہر نکلا' دروازہ بند ہو گیا۔

''برے پھنسے برخوردار عامر میاں!'' عامر نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔

جاتے جاتے وہ شخص دروازے میں بجلی کا کرنٹ ہونے کی بات تو کہہ گیا تھا' لیکن عامر نے سوچا کم از کم دیکھ لینے میں کیا حرج ہے۔ ممکن ہے اس نے غلط ہی کہا ہو۔

☆☆☆☆☆

کمرے میں سوائے فرنیچر کے اور کچھ نہیں تھا۔ عامر نے اپنی جیبوں میں ہاتھ ڈالے۔ ایک لوہے کا سکہ موجود تھا۔ اس نے کچھ فاصلے سے لوہے کا سکہ دروازے پر مارا تو اس میں سے چنگاریاں نکلیں اور ہلکا دھماکہ بھی ہوا جو اس بات کا ثبوت تھا کہ دروازے میں کرنٹ موجود ہے۔

''شاید جناب کو ہماری بات کا یقین نہیں آیا تھا جو آزمانے پر تل گئے۔'' اس کم بخت کی آواز

سنائی دی لیکن وہ نظر نہیں آ رہا تھا۔

''ہم نے آپ سے غلط بیانی نہیں کی تھی جناب۔'' دوبارہ اسی آواز نے کہا۔

''معلوم نہیں کم بخت میری آواز بھی سن پائیں گے یا نہیں۔'' عامر بڑبڑایا۔

''آپ بلا جھجک فرما دیجئے۔ آواز ہم تک پہنچ جائے گی۔'' اسے جواب بھی مل گیا۔

''شکر ہے تم لوگوں تک میری آواز بھی پہنچی۔'' عامر نے کہا۔

''ہم خادم ہیں آپ کے۔''

''افسوس تھوڑی دیر بعد تم اس قابل بھی نہیں رہ جاؤ گے کہ اس طرح چہکتے پھرو۔ جیسے ہی اس بونے شیطان کا کام نکلا وہ تمہارا بھی میرے ساتھ ہی صفایا کر دے گا۔'' عامر نے پھر اسے طیش دلانا چاہا۔

''ہم تو حکم کے غلام ہیں جناب!''

''تم حکم کے غلام نہیں، حکم کے گدھے ہو۔'' عامر بولا۔

''ذرہ نوازی ہے آپ کی۔'' دوسری طرف سے جواب ملا۔

عامر نے اندازہ لگایا اس مرتبہ مقابلے پر اس جیسے ٹھنڈے دماغ کا آدمی ہے جس پر مزید مغز ماری بیکار ہے۔ اس چکنے گھڑے پر اس کی باتوں کا اثر ہوتا دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

اس نے خاموشی اختیار کر لی۔ پھر اٹھ کر کمرے میں ٹہلنا شروع کر دیا۔ اس طرح مسلسل چہل قدمی میں اسے ایک گھنٹہ بیت گیا۔

اچانک دروازہ کھلتا نظر آیا اور ایک شخص ٹرالی دھکیلتا اندر داخل ہوا۔ اس کیلئے کچھ کھانے کو بھیجا گیا تھا۔

''ارے بھائی صاحب!'' عامر نے اسے دو تین آوازیں دے کر اپنی طرف مخاطب کرنا چاہا لیکن وہ ٹس سے مس نہیں ہو رہا تھا۔

''آپ خوامخواہ اپنے گلے کو تکلیف دے رہے ہیں۔ یہ شخص صرف اپنے مطلب کی بات سن سکتا ہے۔'' وہی آواز آئی۔

''اصل میں برادر عزیز میرا مسئلہ کچھ اور ہے۔ میں بھوکا تو رہ سکتا ہوں، خاموش نہیں رہ سکتا۔ اگر ممکن ہو تو باتیں کرنے کیلئے کسی کو میرے پاس بھیج دو۔'' عامر نے جواب دیا۔

''افسوس! ہم آپ کی اس خواہش کا احترام نہیں کر سکتے۔ البتہ بہت جی چاہا تو آپ دیواروں سے باتیں کرتے رہیں۔'' اسی آواز نے عامر کا تمسخر اڑایا۔

''ٹھیک ہے! جیسے تمہاری مرضی۔'' عامر نے بظاہر ہتھیار ڈالتے ہوئے کہا۔

ایک ٹرے میں کافی اور چند سینڈوچ چھوڑ کر وہی شخص ٹرالی دھکیلتا واپس لوٹ گیا۔ عامر کی چھٹی حس نے ایک خطرے کی نشان دہی کر دی تھی۔ اس نے اندازہ لگایا کہ ضرور کافی میں خواب آور دوا ملائی گئی ہے اور یہ لوگ شاید اسے بے ہوش کر کے یہاں سے کسی اور جگہ منتقل کرنا چاہتے ہیں۔ اس نے اس مفروضے کی بناء پر قسمت آزمائی کا فیصلہ کر لیا تھا۔

سینڈوچ تو اس نے کھا لئے لیکن کافی بڑی صفائی سے قالین کا پلو اٹھا کر اس کے نیچے بہا دی۔ اب اس نے اپنے نزدیک کافی کا مگ اس انداز میں رکھا ہوا تھا جیسے واقعی اس نے کافی پی لی ہو۔

ایک صوفے کی پشت سے گردن لٹکا کر وہ بیہوشی کے سے انداز میں لیٹ گیا۔ اب اسے آنے والے وقت کا انتظار تھا۔ اگر اس کا منصوبہ کامیاب رہتا تو عین ممکن تھا کہ اسکی جان بچ جاتی۔ آدھ گھنٹہ گزرنے کو آ رہا تھا۔ ایک ہی پوزیشن میں رکھے رکھے اس کی گردن اکڑ گئی تھی لیکن ابھی تک وہاں کسی کی آمد کے آثار دکھائی نہیں دے رہے تھے۔

عامر مایوس ہو کر گردن سیدھی کرنے ہی والا تھا کہ دروازہ کھلنے کی آواز سنائی دی۔ وہی شخص اندر داخل ہوا جسے سب ''باس'' کہتے تھے۔

''تو جناب آرام فرما رہے ہیں!'' اس نے کہا۔

شاید وہ شخص اس کی بے ہوشی کی تصدیق کرنا چاہتا تھا۔ دو اور آدمی بھی اس کے تعاقب میں اندر آئے تھے کیونکہ ان کی دانست میں عامر بے ہوش ہو چکا تھا۔ اس لئے وہ اس سے بالکل لاپروا نظر آ رہے تھے۔

''اٹھاؤ! اسے!'' اس نے اپنے ساتھیوں کو حکم دیا۔

جیسے ہی اس کے دونوں ساتھی عامر کو دونوں بازوؤں سے پکڑ کر اٹھانے کیلئے آگے بڑھے' عامر نے اپنی دونوں ٹانگیں پوری قوت سے انہیں رسید کر دیں۔ ایک کے پیٹ اور دوسرے کی پسلی میں ٹانگ لگی تھی۔

وہ تو عامر کی طرف سے بے فکر تھے۔ اس اچانک حملے نے انہیں چکرا کر رکھ دیا۔ دونوں الٹ کر بستر پر گرے اور عامر ان کے سر پر سے پرواز کرتا باہر جا گرا۔

دوسرے ہی لمحے وہ برآمدے میں موجود تھا۔

''پکڑو! پکڑو اسے پکڑو ورنہ باس ہمیں جان سے مار ڈالے گا۔'' اسے کسی کے چیخنے چلانے کی آوازیں سنائی دیں۔ عامر دیوانہ وار لیکن بالکل ہوش و حواس کے ساتھ باہر کی سمت بھاگ رہا تھا۔ اسے اس بات کا اندازہ تھا کہ ابھی اس کے تعاقب میں فائرنگ بھی ہوگی۔

یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ اس کوٹھی میں اس وقت زیادہ لوگ موجود نہیں تھے۔ صرف ایک سٹیشن ویگن باہر کھڑی تھی جسمیں ایک ڈرائیور بیٹھا اس کا منتظر تھا اسے باہر بھاگتے دیکھ کر پہلے تو وہ حیران رہ گیا۔ اس سے پہلے کہ اسے معاملے کی سمجھ آتی' عامر نے سامنے والی دیوار کو عبور کر لیا تھا۔ اب وہ سڑک پر بھاگ رہا تھا۔ اور جانتا تھا کہ وہ لوگ باہر آ کر فائرنگ کا خطرہ مول نہیں لیں گے۔ گو کہ سڑک ویران تھی لیکن ابھی دن کا وقت تھا اور وہ کوئی نئی مصیبت مول لینا نہیں چاہتے تھے۔

ایک دو مرتبہ بھاگتے بھاگتے عامر نے مڑ کر دیکھا۔ کوئی اس کے تعاقب میں نہیں آ رہا تھا۔

وہ سیدھا نزدیکی مارکیٹ میں گھس گیا۔ جلد ہی ایک ٹیلی فون پر وہ علی سے رابطہ قائم کر چکا تھا۔

اس کے ٹیلی فون رکھنے کے بمشکل دو تین منٹ بعد ہی اسے پولیس کاروں کے سائرن سنائی دینے لگے۔ شاید اس علاقے میں پولیس گشت کر رہی تھی اور کیپٹن علی نے وائرلیس پر انہیں عامر کی بتائی ہوئی کوٹھی کو گھیرے میں لینے کا حکم دے دیا تھا۔

عامر واپس اسی کوٹھی کی طرف بھاگ رہا تھا جہاں سے وہ فرار ہوا تھا۔ اسے رکنا پڑا۔ وہاں تو

فائرنگ ہو رہی تھی۔ پولیس نے بڑی مستعدی کا مظاہرہ کرتے ہوئے عین اس موقع پر ملزموں کو گھیرے میں لے لیا تھا جب وہ بھاگنے کیلئے پر تول رہے تھے۔

کیپٹن علی بھی وہاں پہنچ چکا تھا۔ ان لوگوں نے بمشکل پندرہ بیس منٹ مقابلہ کیا پھر ہتھیار ڈال دیئے۔

''جان بچی سو لاکھوں پائے۔'' عامر نے علی کی شکل پر نظر پڑتے ہی کہا۔

''لوٹ کے بدھو گھر کو آئے۔'' علی نے جواب دیا۔

دونوں بے ساختہ ہنس دیئے۔

پولیس ملزموں کو گرفتار کر کے لے جا رہی تھی جب عامر ان کے ''باس'' کے پاس پہنچا۔

''میں نے کہا تھا نہ کہ وہ تمہیں قربانی کا بکرا بنا کر بھاگ جائے گا۔'' اس نے کہا۔

''باس'' نے جو تھوڑی دیر پہلے خوب چہک رہا تھا' خوں خوار نظروں سے عامر کی طرف دیکھا اور پولیس کی گاڑی میں بیٹھ گیا۔

☆☆☆☆☆

کار کیپٹن علی خود چلا رہا تھا اور دونوں اس کے ساتھ بیٹھے تھے۔ عامر پچھلی سیٹ پر ٹیپو آگے۔ رات کا پہلا پہر تھا لیکن شام ہی سے چونکہ آسمان بادلوں کی زد میں آیا ہوا تھا اس رات بہت گہری ہو گئی تھی۔

''تم پوچھو گے نہیں ہم کہاں جا رہے ہیں؟'' علی نے عامر کو مخاطب کیا۔

''اس کی ضرورت ہی نہیں۔ آپ ہمیں کسی تفریحی مقام پر تو لے جانے سے رہے۔'' عامر نے جلے کٹے لہجے میں کہا۔

''شاباش! بہت اچھا اندازہ لگایا۔ میں نے سوچا تمہاری ملاقات ایک دو لاشوں سے ہو جائے تو کیا قباحت ہے۔'' علی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''انکل! شاید آپ شمسی کی کوٹھی کی طرف جا رہے ہیں؟'' ٹیپو بولا۔

''شاباش!'' علی نے اس کی طرف تحسین آمیز نظروں سے دیکھا۔

''ظاہر ہے۔ شمسی ہماری نظر میں آ چکا ہے اور اب وہ ٹانگو کیلئے ناکارہ ہے۔ اس نے اب تک شمسی کا صفایا کر دیا ہوگا۔'' ٹیپو نے اپنا خیال ظاہر کیا۔

''واہ میرے ننھے جاسوس!'' عامر بولا۔ ''تم تو خاصے سمجھ دار ہو گئے۔''

''شکریہ انکل! ویسے یہ آپ کی صحبت کا اثر ہے۔'' ٹیپو بولا۔

''میں اس سے اتفاق نہیں کرتا۔'' علی نے کہا۔

''آپ نے کبھی کسی صحیح بات سے اتفاق کیا ہی نہیں۔'' عامر بولا۔

تینوں آپس میں باتیں کرتے شمسی کی کوٹھی کے نزدیک پہنچ چکے تھے۔ کار انہوں نے کچھ فاصلے پر ہی پارک کر دی تھی۔ اب دبے قدموں اس کی کوٹھی کی طرف بڑھ رہے تھے۔ پھر عامر اور علی نے وہیں پوزیشنیں سنبھال لیں اور انہوں نے ٹیپو کو حالات کا جائزہ لینے کے لئے اندر بھیج دیا۔

کسی کمرے سے روشنی باہر نہیں آ رہی تھی۔ ٹیپو ایک مرتبہ پہلے بھی یہاں آ چکا تھا۔ وہ سیدھا اسی کمرے کی طرف چل دیا تھا۔ جلد ہی اسے احساس ہو گیا کہ کوٹھی میں کوئی بھی موجود نہیں ہے۔

اب اس کا رخ اسی خاص کمرے کے دروازے کی طرف تھا۔ ٹیپو نے آہستگی سے دروازے کو دھکا دیا تو وہ کھلتا چلا گیا۔ اس نے اندر داخل ہو کر پنسل ٹارچ روشن کر لی اور اسکی ٹارچ کی روشنی سب سے پہلے شمسی کی لاش پر ہی پڑی تھی۔

ٹیپو ٹھٹک کر رہ گیا۔

اس نے پنسل ٹارچ کی مدد سے سوئچ بورڈ تلاش کر کے کمرے کی لائٹ جلائی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے بوڑھے شمسی کی لاش پڑی تھی اور ایک ننھا سا تیر اس کے حلق میں پیوست تھا۔ یہ ٹانگو کے گروہ کی خاص نشانی تھی۔ اس کے چہرے پر اذیت کے آثار تھے اور وہ پہلو کے بل گرا تھا۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ اس نے حملہ آور کو دیکھ کر جان بچانے کی کوشش کی تھی۔ یہ الگ بات تھی کہ وہ تیر کا نشانہ بن کر رہا۔

ٹیپو نے برآمدے میں آ کر ٹارچ کے مخصوص اشارے سے دونوں کو اندر بلا لیا۔ وہاں دو سوٹ کیس موجود تھے۔ یوں دکھائی دیتا تھا جیسے شمسی یہاں سے بھاگنے کی تیاری کر رہا تھا اور عین

موقع پر تیر کا نشانہ بن گیا۔

''ایک ہی لاش ہے۔ امید ہے آپ کو مایوسی ہوئی ہوگی۔ کیونکہ آپ زیادہ کی امید کر رہے تھے۔'' عامر نے کہا۔

''انکل! اس کی بیٹی غائب ہے۔'' ٹیپو بولا۔

''ارے وہ اس کی بیٹی نہیں تھی بلکہ ایک افریقی ملک کے سفارت خانے میں کام کرتی تھی اور ٹانگو کے گروہ میں شامل تھی۔ یہ وہی ملک ہے جہاں سے ریڈ لائن جہاز آیا ہے۔ وہ تو پلان کے مطابق اس کی بیٹی بن کر یہاں رہ رہی تھی۔ عین ممکن ہے یہ کارنامہ بھی اسی کے ہاتھوں انجام پایا ہو اور اب وہ بھاگ گئی ہو یا پھر ٹانگو نے کسی اور جگہ اسے بھی ٹھکانے لگا دیا ہو۔'' علی نے کہا۔

لاش کی جیبوں کی تلاشی لینے سے کوئی قابل ذکر چیز برآمد نہیں ہوئی تھی۔ علی نے چاہا کہ قریب رکھے فون کے ذریعے پولیس کو اس واردات کی اطلاع کر دے۔

ابھی اس نے دو قدم ہی فون کی طرف بڑھائے تھے جب اچانک اس کی گھنٹی بجنے لگی۔ علی وہیں رک گیا۔ چند لمحے اس نے کچھ سوچا پھر فون اٹھا لیا۔

''ہیلو!'' اس نے آواز بدل کر کہا۔

''گھبراؤ نہیں کیپٹن علی! میں ہوں تمہارا دوست' پرانا دوست۔'' دوسری طرف ٹانگو تھا۔

''مجھے علم تھا کہ تم سیدھے یہیں آؤ گے۔''

''چلو اچھا ہوا۔ تم نے اپنے ہاتھوں ہی اس کا قصہ پاک کر دیا۔'' علی نے کہا۔

اس کے ساتھ ہی اس نے عامر کو اشارے سے کار کی طرف روانہ کیا تاکہ وہ کار میں لگے ٹرانسمیٹر کے ذریعے ایکس چینج والوں کو ہدایت کرے کہ اس نمبر کا پتہ لگائیں۔

''میرا اصول ہے کیپٹن میں نے کبھی پولیس کی نظروں میں آنے والوں کو معاف نہیں کیا۔''

''لیکن وہ بے چارا تو تمہارے کہنے پر ہمارے سامنے آیا تھا۔ ضرور تم نے ہی اسے کہا تھا ہم سے ٹکرائے۔ ظاہر ہے پھر ہم نے تو اس پر نظر رکھنی تھی۔'' علی نے سلسلہ گفتگو طویل کرنا چاہا۔

''میں اپنے ذہن پر زیادہ بوجھ نہیں ڈالا کرتا۔ نہ ہی ایسی فضول باتیں سوچتا ہوں۔ بس و

تمہاری نظر میں آ گیا اسے مر جانا چاہئے تھا۔'' ٹانگو نے قہقہہ لگایا۔

''لیکن اس بے چارے بوڑھے کا کیا قصور تھا؟''

''مجھے علم ہے تمہارے ساتھی اس فون نمبر کی فکر کر رہے ہوں گے لیکن یہ پبلک کال آفس ہے اس لئے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں کبھی کسی کے سوال کا جواب نہیں دیا کرتا۔ لیکن تم بہادر آدمی ہو اس لئے سن لو کہ وہ ہمارے گروہ کا باغی تھا۔ دوسرے گروہ سے مل گیا تھا۔''

''کون دوسرا گروہ؟'' علی نے فوراً پوچھا۔

''ہمارے بھی کچھ اصول ہوتے ہیں مسٹر علی۔'' اس کے ساتھ ہی سلسلہ منقطع ہو گیا۔

فون پر اس نے پولیس کی لاش کی اطلاع دی۔ ابھی وہ فارغ ہی ہوا تھا کہ ٹیپو اور عامر اسے اندر آتے دکھائی دیئے۔

''فون نہیں مل سکا؟'' دونوں نے بیک وقت پوچھا۔

''ہاں! وہ اتنا بے وقوف بھی نہیں۔'' علی نے جواب دیا۔

☆☆☆☆☆

رات کے دو بجے آئی جی صاحب نے اسے نیند سے اٹھا کر موقعہ واردات پر پہنچنے کی ہدایت کی تھی۔ بخاری غصے سے پھنک رہا تھا۔ وہ آج یوں بھی بہت دیر سے سویا تھا کیونکہ اگلے روز چھٹی تھی اور وہ صبح دیر گئے سو سکتا تھا۔ آج سارا دن اس نے دفتر میں فائلوں سے سر کھپایا تھا۔ پھر شام کو ایئرپورٹ پر ڈیوٹی دیتا رہا۔

غصے کی حالت میں اس نے اپنے منہ پر پانی کے چھینٹے مارے اور سادہ کپڑوں میں ہی موقعہ واردات کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس نے راستے میں اپنی جیپ کے ڈرائیور کو دو تین مرتبہ خونخوار طریقے سے ڈانٹ دیا تھا اور وہ سمجھ گیا تھا کہ صاحب غصے میں ہیں۔

جب وہ مطلوبہ جگہ پر پہنچا تو مقامی تھانے کا عملہ وہاں موجود تھا اور لاش والے کمرے میں علی، عامر اور ٹیپو بھی کھڑے تھے۔ انکی شکلوں پر نظر پڑتے ہی بخاری کا خون کھول اٹھا۔

''تم لوگ یہاں کیسے آئے ہو؟'' اس نے بڑے درشت لہجے میں ان سے پوچھا۔

''ایسے''۔ کہہ کر عامر نے اسے چل کر دکھایا۔

''یہ میرے سوال کا جواب ہے کیا؟'' بخاری غصے سے دھاڑا۔

''چچا آپ تو خوامخواہ ناراض ہو رہے ہیں۔ ہم لوگ کیا ہیلی کاپٹر پر بیٹھ کر یہاں آئیں گے۔ ذرا چہل قدمی کو نکلے تھے کہ یہاں پہنچ گئے۔'' عامر نے اسی طرح سنجیدگی سے جواب دیا۔

چچا کے لفظ سے بخاری کو بہت چڑ تھی اور عامر اسے عموماً چچا ہی کہا کرتا تھا۔ اس کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔

''یہ چہل قدمی کا کون سا وقت ہے؟'' بخاری نے اپنی گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

''اوہو! آپ کو شاید علم نہیں کہ یہی تو چہل قدمی کا صحیح وقت ہے۔ ہمارے گورو کہتے ہیں کہ اسوقت پیدل چلنے والا کبھی بیمار نہیں ہوتا۔ آزمائش شرط ہے۔''

''میرا مذاق اڑانے کی کوشش مت کرو۔'' بخاری نے غصے سے کھولتے ہوئے کہا۔

''اجی کس کی ہمت ہے جو آپ کا مذاق اڑائے۔'' عامر نے خوفزدہ ہونے کی اداکاری کی۔

''تمہیں آئی جی صاحب نے بہت سر چڑھا رکھا ہے۔'' کہہ کر بخاری پاؤں پٹختا دوسری طرف چلا گیا۔ اس نے اپنا غصہ مقامی تھانے کے عملے پر نکالنا شروع کر دیا تھا۔ پولیس کے فوٹو گرافر نے مختلف زاویوں سے لاش کی تصاویر اتاریں۔ پھر فنگر پرنٹ سیکشن والے کمرے کی مختلف زاویوں سے انگلیوں کے نشانات تلاش کرنے لگے۔

''تمہیں اپنا بیان لکھوانا پڑے گا اور یہاں موجودگی کی وجہ بھی بتانا ہوگی۔'' دوبارہ وہ علی کی طرف بڑھا۔

''وہ کیوں جناب؟'' علی نے پوچھا۔

''پولیس کو اپنی کارروائی کرنے کیلئے وجہ بیان کرنا ضروری نہیں۔'' بخاری نے نفرت سے کہا۔

''لیکن ہم آئی جی صاحب کو آگاہ کر چکے ہیں۔'' علی نے کہا۔

''کمال ہے چچا! ایک تو ہم نے پولیس کی مدد کی۔ اسے لاش کی اطلاع دی، الٹا ہمیں پر آپ

دھونس جمار ہے ہیں۔'' عامر کی رگ شرارت پھر پھڑکنے لگی تھی۔

''تم سے کس نے پوچھا۔خبردار! ہر معاملے میں ٹانگ نہ اڑایا کرو۔'' بخاری نے اسے ڈانٹنا چاہا۔

''میں نے تو ٹانگ نہیں اڑائی۔'' عامر نے اپنی ٹانگ پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

''میں نے کہا خاموش رہو!'' بخاری نے پھر اسے ڈانٹا۔

''لیکن کیسے رہوں۔زبان خود بخود چل جاتی ہے۔'' عامر نے کہا۔

بخاری کے ماتحتوں کے لئے اپنی ہنسی پر قابو پانا ممکن نہیں رہا تھا۔وہ اپنے منہ پر ہاتھ رکھے باری باری وہاں سے دور چلے گئے۔

''میں تمہاری زبان کو لگام ڈال سکتا ہوں۔'' بخاری بولا۔

''اب آپ پھر غصہ کریں گے حالانکہ لگام زبان کو نہیں' گھوڑے کو ڈالی جاتی ہے۔'' عامر نے کہا۔

''آپ کی بڑی مہربانی ہوگی۔میں بھی اس کی زبان کے ہاتھوں بہت تنگ آچکا ہوں۔'' علی نے کہا۔

''تم میرا مضحکہ اڑا رہے ہو۔'' بخاری اتنے زور سے چلایا کہ پولیس فوٹوگرافر کے ہاتھوں سے کیمرہ گرتے گرتے بچا۔

عملے کے باقی لوگ کھلکھلا کر ہنس دیئے۔اب ان کے لئے ہنسی روکنا ممکن نہیں رہا تھا۔

''دفع ہو جاؤ یہاں سے!'' بخاری دوبارہ دھاڑا۔

''لیکن کہاں جناب! باہر تو بڑی سخت سردی پڑ رہی ہے۔'' عامر نے کہا۔

''جہنم میں!'' بخاری بولا۔

''اسوقت تو وہاں بھی کوئی گھسنے نہیں دے گا۔'' عامر نے اپنی گھڑی کی طرف دیکھ کر کہا۔

تنگ آ کر بخاری کو وہی وہاں سے جانا پڑا۔اس کے وہاں سے ہٹتے ہی پولیس کے سارے عملے پر ہنسی کا جیسے دورہ پڑ گیا تھا۔

☆☆☆☆☆

کار کیپٹن علی چلا رہا تھا اور حسب معمول ٹیپو آگے بیٹھا تھا۔پچھلی سیٹ پر عامر لمبی تان کر لیٹا ہوا خراٹے لے رہا تھا۔وہ یہی ظاہر کرنا چاہتا تھا جیسے گہری نیند سو رہا ہو۔یہ سکول کے بچوں کی چھٹی کا وقت تھا۔اس لئے علی نے کار شہر کے باہر جانے والی شاہراہ پر موڑ لی۔وہ لمبا چکر کاٹ کر شہر میں جانا چاہتے تھے۔

ابھی وہ بمشکل دو میل ہی شہر سے باہر نکلے تھے کہ انہیں اپنے پیچھے دو کاریں تیزی سے آتی دکھائی دیں۔

''جھک جاؤ!'' علی چلایا۔

دونوں کسی مشینی عمل کے تابع جھک گئے۔علی نے بھی اپنی گردن جھکا لی تھی۔دوسری کار کی کھڑکی سے باہر جھانکتی آٹومیٹک رائفل سے ان پر فائرنگ شروع ہو گئی تھی۔اگر علی اچانک نہ جھک جاتا تو جو گولیاں ڈیش بورڈ میں لگی تھیں وہ اس کے سر میں لگتیں۔

یہ صورتحال ان کیلئے نئی نہیں تھی۔نہ ہی وہ ایسے اچانک حملوں سے گھبرانے والے تھے۔تینوں اگلے ہی لمحے تیار ہو چکے تھے۔عامر نے اپنے پاؤں میں رکھی سٹین گن سنبھال لی تھی اور ٹیپو نے اپنے سامنے لگے ڈیش بورڈ کا بٹن دبایا تو ایک ہینڈ گرنیڈ وہاں موجود تھا۔اس نے فوراً دستی بم کی پن نکال لی۔کار کی کھڑکیوں کے شیشے کھل چکے تھے۔

فائرنگ کرنیوالی کار تیزی سے آگے نکل گئی تھی جبکہ دوسری کار فائرنگ کرتی بائیں ہاتھ سے ٹیپو کی سمت سے ان کی طرف آ رہی تھی۔جیسے ہی کار نزدیک پہنچی' ٹیپو نے بڑی دلیری سے اپنا ہاتھ کھڑکی سے باہر نکالا اور بم اس پر پھینک دیا۔

''ویل ڈن!'' علی کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

بم اس کار کی کھڑکی سے سیدھا اندر موجود لوگوں پر گرا تھا۔اسکے ساتھ ہی کیپٹن علی نے کار کو پورے بریک لگا دیئے۔دوسری کار نے ان سے بمشکل تین گز کے فاصلے پر دھماکے سے اڑ گئی۔وہ دھماکے کی زد سے محفوظ رہے تھے۔

ابھی علی بمشکل سنبھلا ہی تھا کہ پہلے والی کار کو انہوں نے پلٹ کر اپنی طرف بڑھتے دیکھا۔

اس کی دونوں کھڑکیوں سے فائرنگ ہو رہی تھی۔علی نے اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے ایک بٹن دبایا تو ان کی کار کی چھت اوپر اٹھ گئی۔

عامر نے اپنی جگہ سے اٹھ کر اس چھت کے سوراخ میں سے سامنے والی کار پر گولیاں برسانی شروع کر دیں۔پہلی ہی گولی ڈرائیور کے ماتھے پر لگی۔علی نے اپنی کار کو تیزی سے دائیں طرف گھما دیا۔

حملہ آور کار کا ڈرائیور سٹیرنگ پر گرا ہوا تھا۔ان کی کار بے قابو ہو کر سامنے درخت سے جا ٹکرائی۔ایک زوردار دھماکہ ہوا اور اس کے بھی پرخچے اڑ گئے۔

''ویل ڈن!''علی کے منہ سے نکلا۔

عامر نے واقعی بہت مشکل نشانہ لیا تھا۔اس طرح چلتی کار سے نشانہ لینا بہت مشکل کام تھا۔

ان کی کار دائیں طرف سے تیزی سے آگے نکل گئی۔ابھی وہ چند سو گز آگے ایک موڑ مڑے ہی تھے جب اچانک ایک ویگن سے ان پر فائرنگ ہونے لگی جو موڑ پر سڑک کے کنارے کھڑی تھی۔علی نے تیزی سے گاڑی آگے بڑھا دی۔

ویگن نے بھاگنا چاہا لیکن علی نے پوری قوت سے بریک لگائی۔اس کے ساتھ ہی عامر نے اس کے دونوں ٹائر گولیاں مار کر پنکچر کر دیئے۔ویگن الٹ کر دور جا گری۔اس نے دو تین قلابازیاں کھائی تھیں۔

''باہر کود جاؤ!''اچانک علی چلایا۔

تینوں نے باہر چھلانگیں لگا دیں۔

علی نے اپنے پیچھے آنے والی ایک تیز رفتار کار کو دیکھ لیا تھا جو ان کی کار سے ٹکرا کر زوردار دھماکے سے رک گئی۔تینوں نے فٹ پاتھ کے ساتھ پوزیشن سنبھال لی تھی۔الٹنے والی کار سے حملہ آور نکل کر ان پر فائرنگ کرنے لگے تھے۔

عامر کے پاس سٹین گن اور علی کے پاس اس کا سروس ریوالور تھا۔جب کہ ٹیپو خالی ہاتھ تھا۔

وہ اپنی تربیت کے مطابق جگہ بدل بدل کر حملہ آوروں کا مقابلہ کرتے رہے۔قریباً دس منٹ

بعد جب ان کی گولیاں بھی ختم ہو چلی تھیں پولیس ان کی مدد کو پہنچ گئی۔اب بدمعاشوں اور پولیس کے درمیان مقابلہ جاری تھا۔

بیس منٹ کے مقابلے کے بعد جب وہاں آٹھ لاشیں موجود تھیں، پولیس نے دس بدمعاشوں کو اسلحے سمیت گرفتار کر لیا۔یہ سب شہر کے مانے ہوئے غنڈے تھے جنہیں ٹانگو نے ان کی توقعات سے زیادہ اسلحہ دے کر اس گھناؤنے کام کے لیے رضامند کیا تھا۔

☆☆☆☆☆

پولیس کے روبرو ان بدمعاشوں نے بہت سے انکشافات کیے۔اور ٹانگو کے کئی ٹھکانے بھی بتا دیے۔ساری رات پولیس کی گاڑیاں ٹانگو کے مختلف ٹھکانوں پر چھاپے مارتی رہیں لیکن وہ پولیس کے قابو نہ آ سکا۔

معاملہ اتنا سنگین تھا کہ کرنل شیرازی، خود علی اور اس کے ساتھیوں کی عیادت کو آ گئے تھے۔آج کل کسی مجرم کو اس طرح ان پر قاتلانہ حملے کرنے کی جرات نہیں ہوئی تھی۔کرنل شیرازی کے حکم سے فوج کے نمائندوں نے سویلین لباس میں تینوں کی حفاظت کی ذمہ داری طے کی تھی۔

''اب وہ بچ نہیں سکتا۔''علی نے کرنل صاحب سے کہا تھا۔اب اس پر جنون طاری ہو چکا ہے۔ایک ایک کر کے اس کے اڈے ختم ہو رہے ہیں۔اسے مجبور ہو کر اپنے بل سے باہر آنا ہی پڑیگا اور جیسے ہی وہ اپنے بل سے باہر نکلا، ہم اسے کچل ڈالیں گے۔انشاءاللہ''اس نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔

میرا تو کچھ اور خیال تھا۔''عامر بظاہر بہت سنجیدگی سے بولا۔

''کیا؟''کرنل شیرازی نے پوچھا

''اگر ممکن ہو تو ہمارے لیے ذرہ بکتروں کی بندوبست کر دیجیے۔مجھے تو اس کے تیروں سے بہت خوف آتا ہے۔''عامر نے کچھ اس طرح کہا کہ سب ہی لوگ ہنس دیے۔

☆☆☆☆☆

صبح سے یہ چوتھا فون تھا جسے سن کر علی بے دم سا ہو کر صوفے پر ڈھیر ہو گیا۔

''خیریت!'' عامر بولا۔

''چوتھا سرکاری اہل کار صبح سے مارا جا چکا ہے۔'' علی نے بے دلی سے کہا۔

''اوہ میرے خدایا! یہ بخاری کیا جھک مار رہا ہے۔ پولیس کیا اپنے ملازمین کی حفاظت بھی نہیں کر سکتی۔'' عامر نے غصے سے کہا۔

''صبر برخوردار صبر! اس معاملے میں کوئی کچھ نہیں کر سکتا۔ بخاری بے چارا کیا کرے گا۔ کیا وہ ہر سرکاری اہلکار کے ساتھ ایک ایک تھانہ نتھی کر دے۔ تم جانتے ہو جن تیروں کی مدد سے یہ لوگ دوسروں کو ہلاک کرتے ہیں انہیں فائر کرنے کے لئے کسی توپ کی ضرورت نہیں ہوتی، ایک معمولی سے پلاسٹک نما کھلونے سے وہ تیر پھینکا جاتا ہے۔ اور اتنا زہریلا ہوتا ہے کہ کسی کو سانس لینے کی مہلت نہیں دیتا۔ اب پولیس کیا شہر بھر کے کھلونوں کی دکانوں پر گھومتی پھرے اور ایک ایک سے پوچھے کہ جناب آپ تیر اندازی کا شوق تو نہیں فرماتے۔

تینوں گہری سوچ میں ڈوب گئے۔ ایک ہی دن میں چار سرکاری اہل کاروں پر حملے اور موت کی خبریں اگلے روز جب اخبارات میں چھپیں تو ایک قیامت ہی آ گئی۔

حکومت کے خلاف بیانات کا سلسلہ جاری ہو گیا۔ ادھر اعلیٰ حکام بار بار امید طلب نظروں سے کیپٹن علی کو دیکھ رہے تھے اور اس کے پاس فی الوقت ناگو کا کوئی کلو بھی باقی نہیں رہا تھا۔

اندھیرے کا تیر

''افسوس تو اس بات کا ہے کہ ہم نے ایک ایک کر کے اس کے تمام ٹھکانے بھی ضائع کر دیئے۔'' عامر بولا۔

''اس کے باوجود میرا دل گواہی دیتا کہ وہ ایک دو روز میں ہمارے قابو ضرور آ جائے گا۔'' علی نے امید افزا نظروں سے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا۔

''وہ مارا!'' اچانک عامر کے منہ سے نکلا اور اس نے سیٹی سی بجائی۔

''کیا ہو گیا؟'' خیریت تو ہے! تم کیوں ابنارمل ہو رہے ہو؟'' علی نے پوچھا۔

''ایک بات ذہن میں آئی لیے۔'' عامر بولا۔

''کیا انکل؟ ٹیپو نے دیکھا۔

''وہ کلیرنگ آفس کیوں نہ چیک کیا جائے جہاں راجہ جایا کرتا تھا۔''

''واہ میرے شیر!'' علی نے اس کی پیٹھ پر دھول جمائی۔

''واہ جی واہ! یہ عجیب طریقہ ہے شاباش دینے کا۔'' عامر نے اپنی کمر سہلاتے ہوئے کہا۔

''کبھی کبھی تو یار تم کمال کر دیتے ہو۔''

یہ تو میں اپنی کھوپڑی صحیح استعمال نہیں کرتا ورنہ نہ جانے کیا سے کیا ہو جائے۔'' عامر نے کہا۔

تینوں مسکرا دیئے۔ ان کے کھنچے ہوئے اعصاب ڈھیلے پڑنے لگے تھے۔ علی کو امید تھی کہ عامر نے جو تیر اندھیرے میں پھینکا ہے وہ ضرور ٹھکانے پر لگے گا۔

اس نے انسپکٹر ناصر، ٹیپو اور عامر تینوں کو اسی مہم پر بھیجا تھا کہ وہ جلد از جلد جتنی زیادہ معلومات اس کمپنی کے متعلق حاصل کر سکتے ہیں اس تک پہنچا دیں۔ دوپہر تک اسے جو معلومات حاصل ہوئیں وہ چونکا دینے والی تھیں۔

اس کلیرنگ کمپنی کو افسر نام کا ایک سابقہ بدمعاش چلا رہا تھا۔ افسر کبھی مانا ہوا اسمگلر تھا لیکن اس نے تائب ہونے کے بعد شریف شہری کی حیثیت سے زندگی گزارنا شروع کر دی تھی اور پولیس کو بھی یقین تھا کہ اب وہ ایسے کام نہیں آتا۔

یہ الگ بات کہ اب وہ پہلے سے بھی زیادہ خطرناک کام کر رہا تھا اور اس نے شرافت کی آڑ میں گھناؤنا دھندا شروع کر رکھا تھا۔ افسر غیر ممالک سے آنے والی ناجائز چیزوں کی کلیئرنگ کا کام کر رہا تھا۔ آج تک علی کے ملک میں جو اسلحہ غیر قانونی طور پر پکڑا گیا تھا اس میں زیادہ تر اس شخص کا ہاتھ تھا۔ لیکن وہ کمال کا مجرم تھا کہ مجال ہے جو پولیس کو اس پر کبھی شک بھی گزرا ہو۔

علی کے لیے زیادہ چونکا دینے والی بات یہ تھی کہ ''ریڈ لائن'' جہاز اسی کمپنی کی معرفت آ رہا تھا۔ اس جہاز سے متعلق معاملات کو اس کمپنی نے نمٹانا تھا۔ جب کہ ''ریڈ لائن'' سے کوسٹ گارڈ نے بہت سا غیر قانونی اسلحہ برآمد کر لیا تھا اس کے باوجود کسی نے اس شخص کی طرف توجہ نہیں دی تھی۔

☆☆☆☆☆

افسر جیسے ہی اپنے دفتر سے اتر کر کار پارکنگ کی طرف بڑھا، وہیں پہلے سے موجود ایک غیر ملکی اس کے نزدیک آ گیا۔ دونوں اس طرح ملے جیسے اچانک ان کی ملاقات ہو گئی ہو۔ وہ شخص افسر کے ساتھ ہی بیٹھ گیا اور دونوں اس کے فلیٹ کی طرف چل دیے۔

افسر رہنے والا تو کسی اور شہر کا تھا لیکن اس نے یہاں ایک شان دار دو منزلہ فلیٹ کرائے پر

لے رکھا تھا۔ عامر، انسپکٹر ناصر اور ٹیپو بڑی ہوشیاری سے اس کا تعاقب کر رہے تھے۔ تعاقب کا یہ سلسلہ افسر کے فلیٹ پر ختم ہوا۔

کار انہوں نے دور ہی پارک کر دی تھی اور اب فلیٹ کے گرد پہرہ دینے لگے۔ رات گہری ہونے لگی تھی لیکن ابھی تک نہ کوئی اندر سے باہر آیا نہ ہی باہر سے اندر گیا۔

''میرے خیال میں اندر ہی قسمت آزمائی کی جائے۔'' عامر نے تجویز پیش کی۔

''میرا بھی یہی حال ہے۔'' ناصر بولا۔

تھوڑی ہی دیر بعد ٹیپو اندر داخل ہونے کے لیے پر تول رہا تھا۔ اس کے کپڑوں میں وائی ٹا کی موجود تھا جس کے ذریعے اس نے ان لوگوں کو اندر کے حالات کی اطلاع دینی تھی۔

ٹیپو عمارت کے پائپ کے ذریعے فلیٹ کی چھت پر پہنچ گیا۔ ابھی اس نے پہلا قدم ہی رکھا تھا جب اچانک ایک پستول کی نالی اس کی کنپٹی سے لگ گئی۔

''ہینڈز اپ!'' کسی نے کہا۔

ٹیپو نے فوراً ہاتھ کھڑے کر دیے۔

''معاف کرنا بھائی صاحب! مجھے علم نہیں تھا کہ آپ یہاں موجود ہوں گے۔ کیا کریں۔ ایک ہفتے سے فاقے کر رہے ہیں۔ کوئی دھندا نہیں ہو رہا۔ شہر میں ہر طرف پولیس گشت کر رہی ہے اور گورو نے کہا ہے کہ اگر آج خالی ہاتھ آئے تو ہمیشہ کے لیے چھٹی۔ جناب والا! پیٹ کے ہاتھوں مجبور ہو کر آیا ہوں۔'' ٹیپو کی زبان قینچی کی طرح چل رہی تھی۔

''شٹ اپ! ابھی دیکھ لیتا ہوں تم کون ہو۔'' اس شخص نے کہا۔

''ایک منٹ بھائی جان! میں اکیلا ہی کیوں پھنسوں۔ وہ جو میرے ساتھ والا نیچے کھڑا ہے اسے میں اوپر بلا لوں۔ کمال ہے! مزے اکٹھے کیے اور جیل میں اکیلا جاؤں گا۔'' ٹیپو نے اس طرح کہا جیسے واقعی اپنے ساتھ والے چور کو بھی پھنسانا چاہتا ہو۔

اتنا کہتے ہوئے وہ اچانک نیچے کو جھکا اور اپنی ایک ایڑی پر گھوم کر اس نے دوسری لات اتنی زور سے حملہ آور کے پیٹ میں ماری کہ اسے دوسرا سانس لینا نصیب نہ ہوا۔ یہ اس کا خاص داؤ تھا

جو وہ لوگ انتہائی ناگزیر حالات میں لگایا کرتے تھے۔

پہرے دار بے ہوش ہو چکا تھا۔

ٹیپو نے واکی ٹاکی کے ذریعے سارا واقعہ عامر تک پہنچایا جس نے اسے فی الحال انتظار کرنے کو کہا تھا۔

عامر کے اشارے پر انسپکٹر ناصر کار میں پہنچا اور اس نے کار میں لگے ٹرانسمیٹر کے ذریعے علی کو تمام حالات سے باخبر کیا۔

''میں خود آ رہا ہوں۔ فی الحال کچھ نہ کرنا''۔ علی نے کہا اور سلسلہ منقطع ہو گیا۔

اس نے اندازہ لگا لیا تھا کہ دال میں ضرور کچھ کالا ہے اور اس مرتبہ وہ نہیں چاہتا تھا کہ ٹانگو کو ہاتھ سے نکلنے دے۔ اس نے براہ راست اس کھیل میں کودنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

علی اور عامر چھت پر پہنچ چکے تھے۔ علی کی ہدایت پر عامر نے بے ہوش پہرے دار کے کپڑے پہن لیے تھے۔ دونوں کو کچھ سمجھا کر وہ نیچے اتر آیا۔ اب صورت حال یہ تھی کہ عامر پہرے دار کی جگہ موجود تھا اور اس نے ٹیپو کو دوسری منزل کے اس کمرے کے روشندان میں فٹ کر دیا تھا جہاں سے روشنی چھن کر باہر آ رہی تھی۔

جیسے ہی روشندان سے ٹیپو نے اندر جھانکا وہ بھونچکا رہ گیا۔ ٹانگو یہاں پہلے ہی سے موجود تھا۔ اس مرتبہ ٹانگو نے بہت ہوشیاری دکھائی تھی اور پہلے ہی سے وہاں آ گیا تھا تاکہ اگر کوئی اس کا تعاقب کرتا ہوا آئے تو باہر ہی اس کا انتظار کرتا رہے اور وہ اپنا کام کر کے واپس چلا جائے۔

افسر اور وہی غیر ملکی بھی وہاں موجود تھے۔ تینوں کے درمیان کسی مسئلے پر بحث ہو رہی تھی۔

''ڈاکٹر ٹانگو! مجھے تمہاری بہادری اور ذہانت کا اعتراف ہے۔ لیکن میرا ملک یہ نہیں چاہے گا کہ اس کا نام کسی بھی غلط سلسلے میں آئے۔'' افسر کی آواز سنائی دی۔

''جہنم میں گیا تمہارا ملک! مجھے اپنا انتقام لینا ہے اور میں مزید تاخیر برداشت نہیں کر سکتا۔ چند دنوں میں یہ کام ہو جانا چاہیے ہر صورت میں۔'' ٹانگو نے غصے سے پھنکارتے ہوئے کہا۔

''میرا خیال ہے باس! آپ نے اس کی بات کو سمجھا نہیں۔ اصل میں.....'' غیر ملکی نے افسر

کی حمایت میں کچھ کہنا چاہا۔

''شٹ اپ!'' ٹانگو نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''تم جانتے ہو میں اپنی بات سے اختلاف کرنے والوں کو کیا سزا دیا کرتا ہوں۔

''غلطی ہو گئی باس! مم معافی دے دیجیے۔'' اس نے ہکلاتے ہوئے کہا۔ ''آئندہ آپ کے ہر حکم کی تعمیل ہو گی۔''

ٹیپو نیچے اتر آیا۔ اس نے عامر کو ساری گفتگو بتا دی۔ عامر نے فوراً کار ٹرانسمیٹر پر کیپٹن علی کو اطلاع دے دی۔

جس نے انہیں مزید ہدایات دیں اور ایک مرتبہ پھر عامر کی مدد سے ٹیپو اسی روشندان میں فٹ ہو گیا۔ اس نے اپنا ننھا سا پستول بھی نکال لیا تھا۔ جب کہ عامر نے فلیٹ کے دروازے کے باہر پوزیشن سنبھال رکھی تھی۔

☆☆☆☆☆

فلیٹ کے چوکیدار نے دروازے کھولا تو اس کے سامنے محکمہ بجلی کے دو ملازمین کھڑے تھے۔

''کیا بات ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''جناب! یہاں سے کسی نے لائٹ خراب ہونے کی رپورٹ لکھائی ہے۔'' ان میں سے ایک نے جو کیپٹن علی تھا، کہا۔

''لیکن ہماری بجلی تو ٹھیک ہے۔'' چوکیدار بولا۔

''ہمارا کیا دماغ خراب ہے جو اتنی سردی میں یہاں مارے مارے پھر رہے ہیں۔ آخر رپورٹ لکھائی گئی ہے۔ تب ہی ہم آئے ہیں۔'' دوسرا انسپکٹر ناصر تھا جو بولا۔

''آپ لوگوں کو غلط فہمی ہوئی ہے۔'' چوکیدار نے کہا۔

اتنے میں دونوں آدمی جو شاید سامنے ہی کھڑے تھے وہاں آ گئے۔ دونوں انہیں دیکھ کر ہی آئے تھے۔

''کیابات ہے؟''ان میں سے ایک نے پوچھا۔

علی نے پھر وہی بات دہرادی۔

''ٹھیک ہے۔بجلی خراب ہوئی تھی۔ میں نے ہی رپورٹ لکھوائی تھی۔لیکن معمولی نقص تھا۔ ہم نے خود ہی دور کرلیا۔''ان میں سے ایک نے جان چھڑانے کے انداز میں کہا۔

''ٹھیک ہے۔ٹھیک ہے۔اس کاغذ پر دستخط کردیں۔اور آئندہ خوامخواہ تنگ نہ کیا کریں۔'' علی نے کہااور تھیلے سے ایک کاغذ نکال کران کے سامنے کردیا۔ناصر نے اپنی پنسل دستخط کے لیے انہیں دے دی۔

جیسے ہی ان میں سے ایک دستخط کے لیے آگے بڑھا علی کی زوردار لات اس کے پیٹ میں لگی۔وہ اپنے ساتھی پر گرا۔یہی سلوک ناصر نے چوکیدار کے ساتھ کیا تھا۔تینوں کے سنبھلنے سے پہلے ہی انہوں نے پستول نکال لیے۔

''الو کے پٹھو! غریبوں کو تنگ کرتے ہو۔باہر نکلو۔''علی نے انہیں پستول سے باہر نکلنے کا اشارہ کیا۔

جیسے ہی وہ باہر آئے، دیوار سے چپکے خفیہ پولیس کی آدمیوں نے انہیں قابو کرلیا اور انہیں سڑک کی پرلی طرف موجود ٹرک میں لے جاکر بٹھادیا۔

☆☆☆☆☆

ناصر کو عامر نے دبے قدموں دروازے کے نزدیک آتے دیکھ لیا تھا۔کیپٹن علی اس کے تعاقب میں دبے قدموں اوپر آرہا تھا۔باہر سے فلیٹ کو خفیہ پولیس کے آدمیوں نے گھیرے میں لے رکھا تھا۔اس مرتبہ ایس۔پی بخاری نے بھی کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی اور آئی جی صاحب کی طرف سے اطلاع ملتے ہی اس نے سارے علاقے کو گھیرا ڈال لیا تھا۔اس نے اپنے ماتحتوں کو سختی سے تلقین کردی تھی کہ اگر یہاں سے کوئی چڑیا بھی نکل کر بھاگی تو ان کی کم بختی آجائیگی۔

کیپٹن علی کے اشارے پر عامر اور ناصر نے اپنے پستول نکال لیے تھے۔دونوں نے پیشہ ور فوجیوں کے سے انداز میں دروازے کو کندھوں کے زوردار جھٹکے سے کھول دیا۔

کمرے میں موجود افسر، ٹانگو اور غیر ملکی انہیں دیکھ کر ہکے بکے رہ گئے۔

''ہینڈز اپ!''عامر نے للکارا۔

دونوں نے ہاتھ اٹھادیے لیکن ڈاکٹر ٹانگو نے حیرت انگیز پھرتی کا مظاہرہ کیا۔وہ پلک جھپکتے میں افسر اور غیر ملکی کے سر پر سے گزرتا دروازے تک پہنچا تھا تاکہ اس کے ذریعے باہر فرار ہوسکے۔ پھر وہاں موجود لوگوں نے ایک عجیب وغریب منظر دیکھا۔جتنی پھرتی سے ٹانگو باہر لپکا تھا اتنی ہی تیزی سے دوبارہ اندر آگرا۔

دروازے میں کیپٹن علی کھڑا مسکرا رہا تھا۔

''ٹانگو! تمہارا کھیل ختم ہوگیا۔''

''ٹانگو کا کھیل کبھی ختم نہیں ہوسکتا کیپٹن علی! کہتے ہوئے ٹانگو اچانک لپکا اور جب وہ کھڑا ہوا تو اس کے ہاتھ میں خنجر موجود تھا۔

''خبردار فائر نہ کرنا!''علی نے عامر اور ناصر کو تلقین کی جو دروازے میں پستول لیے کھڑے تھے۔

''ٹانگو تمہیں اپنی خنجر زنی پر بہت ناز ہے۔آ اور خود کو آزمالو۔میں نہیں چاہتا کہ تم دل میں کوئی حسرت ہی لے کر مرجاؤ۔''علی کی آواز سے قہر چھلک رہا تھا۔

ٹانگو نے دیوانہ وار اس پر حملہ کیا تھا۔وہ ہاتھ میں خنجر تانے اڑتا ہوا اس کی طرف آیا۔عین انہی لمحات میں علی نے بھی فضا میں قلابازی لگائی اور جب دونوں زمین پر گرے تو ڈاکٹر ٹانگو کے منہ سے درد کی شدت سے چیخ نکل گئی تھی۔

وہ زمین پر گرا بے بس پرندے کی طرح تڑپ رہا تھا۔خنجر اس کے ہاتھ سے نکل کر دور جا گرا تھا۔افسر اور غیر ملکی پھٹی پھٹی نظروں سے یہ سارا منظر دیکھ رہے تھے۔

''ٹانگو، میں نے کہا تھا کہ تمہارا کھیل ختم ہوگیا۔تم نے اپنے اس خنجر سے جانے کتنے بے گناہوں کی جان لی ہوگی۔میں نے آج تمہاری دونوں کلائیاں توڑ ڈالی ہیں۔دنیا کا کوئی ڈاکٹر اب انہیں جوڑ نہیں سکتا۔ٹانگو! تم اب خود موت کی تمنا کرو گے۔محتاج بن کر زندگی گزارنا شاید

تمہارے لیے ممکن نہ رہے۔ آج کے بعد تمہارے ہاتھ کسی کی جان لینے کی قابل نہیں رہیں گے۔'' علی نے کہا۔

''ٹانگوز مین پر گرا تڑپ رہا تھا۔ عامر کے اشارے پر باہر موجود خفیہ پولیس نے اندر رہا۔ بول دیا تھا۔

کوٹھی میں اور کوئی موجود نہیں تھا۔ ٹانگو اور اس کے ساتھیوں کو پولیس والے گرفتار کر کے اپنے ساتھ لے گئے۔ عامر، ناصر اور ٹیپو کے ساتھ ساتھ علی نے بھی ٹانگو کی گرفتاری پر سکھ کا سانس لیا تھا۔ انہیں آج تک ایسے مجرم سے کم ہی واسطہ پڑا تھا۔

مڈاشا کے سفارت خانے میں ایک خاص تقریب منعقد کی گئی جس میں دنیا کے بہت سے ملکوں کے سفیروں نے شرکت کی تھی۔ اس تقریب میں مڈاشا کے سفیر کے علاوہ دنیا کے اور ملکوں کے سفیروں نے بھی کیپٹن علی کی حکومت کا شکریہ ادا کیا جس کی وجہ سے انہیں اس دور دسر سے نجات ملی تھی۔ اس خصوصی تقریب میں کیپٹن علی۔ عامر، ٹیپو اور انسپکٹر ناصر کے علاوہ ولیم کو بھی انعام سے نوازا گیا کیونکہ اس نے بھی ان لوگوں کی بہت مدد کی تھی۔ تقریب میں ایس۔ پی بخاری بھی موجود تھا جو ان کو انعام ملنے کی خوشی میں سب کے ساتھ مل کر تالیاں بجا رہا تھا۔

''ہیں! یہ کیا؟'' عامر نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

''برخوردار! آج میرا موڈ خراب نہ کرنا'' بخاری نے کہا۔

''جو حکم چچا!'' عامر بولا۔

اس مرتبہ قہقہہ لگانے والوں میں بخاری بھی شامل تھا۔